علی گڑھ میگزین

انتخاب کلام شعرائے علی گڑھ

نگراں

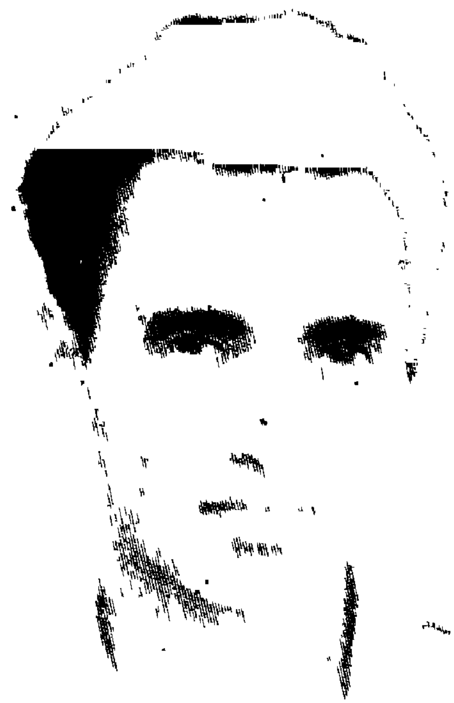
ڈاکٹر خورشید الاسلام

ایڈیٹر

عنایت حسین عیدن

سنہ ۱۹۷۰ء

(نوشتہ زیدی لکھنوی)

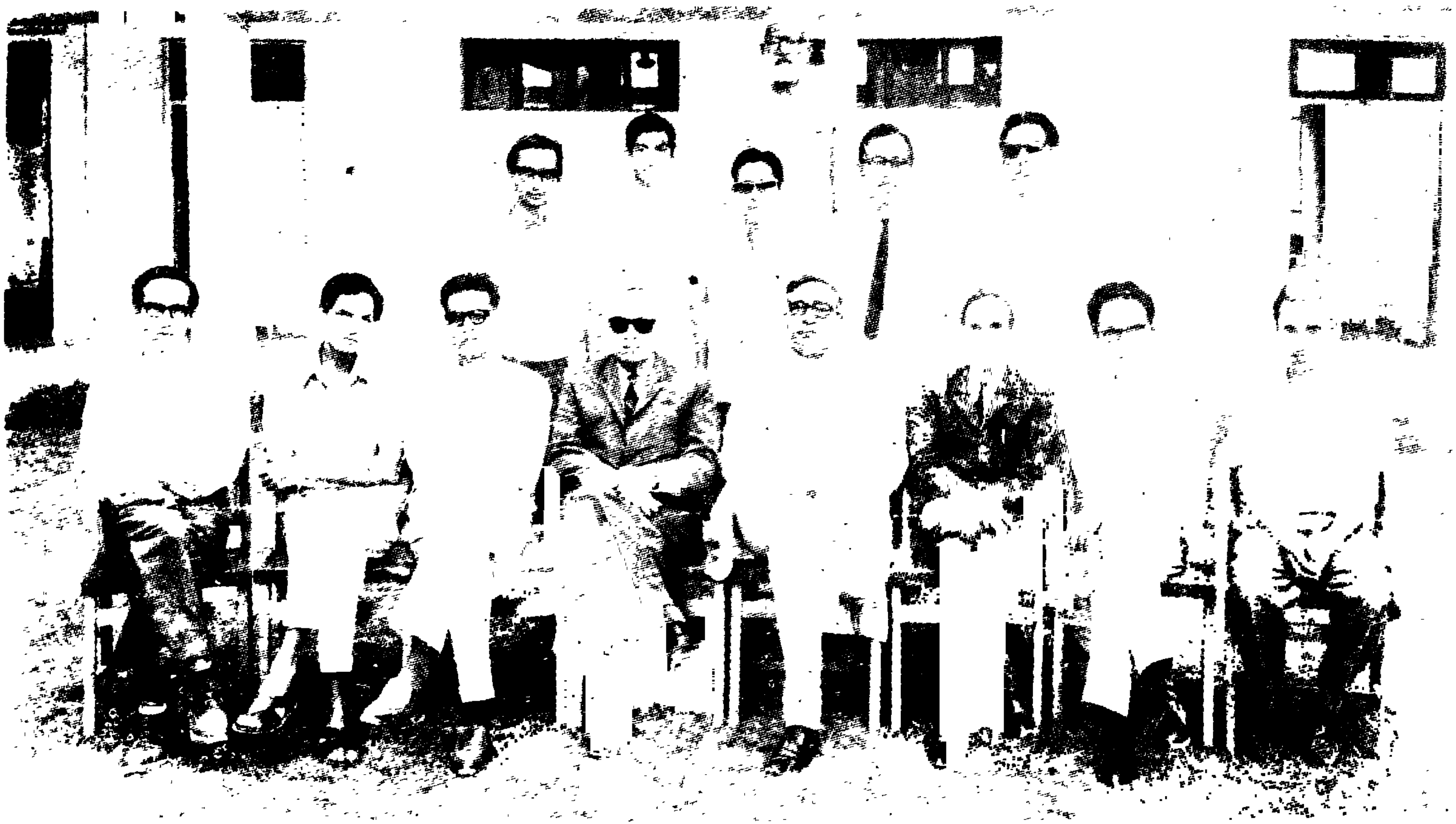


عنایت حسین عیدن

ایڈیٹر

ترتیب

مطبوعہ لیتھو کلر پرنٹرس [illegible]



پہلی صف—عنایت حسین عیدن (ایڈیٹر) شمیم حنفی - خلیل الرحمن اعظمی، خورشید الاسلام، خواجہ مسعود علی ذوقی،
منیب الرحمن، شہریار، وحید اختر۔

علی گڑھ میگزین کا یہ شمارہ شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ اس شمارہ میں ہماری مادر درسگاہ کے ان شعرا کے کلام کا انتخاب ہے جو یونیورسٹی سے منسلک ہیں اور ان میں سے اکثر اردو ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

اردو شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں علی گڑھ کا ہمیشہ سے ایک اہم رول رہا ہے۔ یوں تو جدید نظم اور جدید شاعری کا آغاز ہالرائڈ اور آزاد کی کوششوں سے ظہور میں آیا لیکن صحیح معنوں میں اس رجحان کو سرسید کے زیر اثر علی گڑھ میں تقویت حاصل ہوئی۔ شبلی تو علی گڑھ کالج سے باقاعدہ منسلک تھے۔ حالی اور اس دور کے دیگر شعرا جنھوں نے اردو شاعری کو نئی سمتوں سے روشناس کیا کسی نہ کسی طرح سے علی گڑھ اور سرسید سے متاثر اور متعلق تھے۔ اردو غزل کو اس کا کھویا ہوا وقار دوبارہ دلانے والے حسرت موہانی یہیں کے ممتاز طالب علم تھے۔ فانی اور مجاز بھی یہاں کے باقاعدہ طالب علم تھے اور ان کی ذہنی تربیت میں یہاں کی روایت کو بڑا دخل تھا۔ اصغر، جگر اور دوسرے شعرا بھی ذہنی طور پر علی گڑھ سے وابستہ رہے۔

ہماری تہذیب میں شاعری کو اہم مقام حاصل ہے۔ آج کی زندگی بڑی متنوع پیچیدہ اور تیز رفتار ہے۔ اور یونیورسٹی کا دائرہ صرف ادبیات تک محدود نہیں۔ سائنس، ریاضی، قانون، دینیات اور دیگر شعبے اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے فطری طور پر ہر طالب علم کا شعر [illegible] سے خصوصی تعلق رکھنا آسان نہیں ہے، لیکن یہ بات طے

شدہ ہے کہ دیگر مضامین کے طلبا کے لیے بھی ادب کا مطالعہ ان کی ذہنی صحت کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں اردو زبان جس بحرانی دور سے گزر رہی ہے اس کی وجہ سے نئی نسل کو اردو شعر و ادب سے صحیح طور پر فیضیاب ہونے کے مواقع آسانی سے میسر نہیں آتے۔

انھیں خیالات کے پیش نظر موجودہ دور کے علی گڑھ کے شعرا کا یہ انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ مغرب میں ایسے شعری انتخابات کا رواج عام ہے اور ان کی افادیت کے سبھی معترف ہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے تمام شعرا کا ایسا انتخاب شائع کیا جاتا جو ایم۔ اے۔ او کالج سے لے کر آج تک کی تمام اہم شخصیتوں پر محیط ہو۔ مگر یہ کام خاصا دشوار ہے۔ البتہ اگر ہر پندرہ سال کے بعد ایک ایسا انتخاب پیش کیا جاتا رہے تو آئندہ کام کرنے والوں کے لیے بڑی آسانیاں ہو سکتی ہیں اور ان کے وسیلے سے ان شعرا کا ادبی سرمایہ بھی محفوظ رہے گا جو کسی وجہ سے شہرت سے محروم رہے۔

ہمیں سخت افسوس ہے کہ جذبی صاحب نے اس انتخاب میں اپنا کلام شامل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

ہمیں اپنی تنگ دامانی، محدود وقت اور وسائل کی کمی کا اعتراف ہے صفحات بھی ہمارے پاس کم تھے اسی لیے انتخاب اتنا مفصل نہ ہو سکا جتنا کہ ہمارا ارادہ تھا پھر بھی کمیت کی تلافی کیفیت سے ہو جائے گی کیونکہ یہ انتخاب ایک طرح سے انتخاب الانتخاب ہے۔

ہمارے شعبۂ اردو کو یہ شرف حاصل ہے کہ اردو کی اشاعت اور ترقی کے لیے اس کا دائرۂ عمل صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اس کے ذریعہ اردو کا کام ہو رہا ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے شکاگو یونیورسٹی تشریف لے گئے تھے اور حال ہی میں وہاں سے واپس آئے ہیں۔ امریکہ اور کنیڈا کی کئی ممتاز یونیورسٹیوں میں انھوں نے اردو ادب پر لکچر دیے۔ ان کا قیام وہاں تقریباً چھ مہینہ رہا۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام بھی حال ہی میں انگلینڈ سے واپس آئے ہیں۔ وہاں پر انھوں نے غالب پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب انگریزی میں لکھی جس کا دنیا کے دانش وروں نے خیر مقدم کیا۔ غالب صدی کے سلسلے میں ہارورڈ یونیورسٹی کی طرف سے غالب کی اردو، فارسی شاعری کا ترجمہ کرنے کا کام بھی ان کو سونپا گیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام اس سے قبل لندن اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز میں اردو کے استاد کی حیثیت سے رہ چکے ہیں۔ اب وہ پھر انگلینڈ جا رہے ہیں جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی میں اردو درسیات کی بنیاد ڈالیں گے اور تحقیق کے کام کی نگرانی فرمائیں گے۔ ساتھ ہی آکسفورڈ یونیورسٹی کی سرپرستی میں رالف رسل صاحب کے ساتھ اردو انگریزی اور انگریزی اردو لغت ترتیب دیں گے۔ رالف رسل صاحب بھی علی گڑھ میں مختلف زمانوں میں رہ چکے ہیں۔ آج وہ مغرب میں اردو کے ایک بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔ اردو سے انھیں جو بے پناہ محبت ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ آج کل وہ لندن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ اطہر پرویز صاحب شعبۂ اردو کے ایک اور استاد ماریشس گئے ہوئے ہیں جہاں وہ اردو کی ترقی کے لیے بہت کام کر رہے ہیں۔

حال ہی میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کی صدارت میں شعبۂ اردو کی طرف سے ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس کا موضوع "۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کا اردو ادب" تھا۔ اس سیمینار میں علی گڑھ کے اساتذہ نے حصہ لیا۔ اس میں ۱۹۴۷ء کے بعد کے ادب کے حدود کو متعین کرنے اور جدید ادب کی واضح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سیمینار کے تمام مضامین اور روداد جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔

اس سال کے دوران ہمارے اساتذہ کے متعدد مضامین اور کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ مثلاً جدیدیت اور ادب' پروفیسر آل احمد سرور نے مرتب کی ہے۔ اس میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جو 'جدیدیت' کے سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ ایک دوسری کتاب

تنقید کے بنیادی مسائل" بھی شعبہ اردو سے شائع کی گئی ہے اور اس کے مرتب بھی پروفیسر سرور ہیں۔ غالب پر انگریزی میں ان کی کتاب تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے۔ خورشید الاسلام اور رالف رسل صاحب کی کتاب GHALIB: LIFE AND LETTERS یونسکو کی طرف سے جارج الین اینڈ انون نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں غالب کی مکمل سوانح ہے اور زندگی کے بیان میں قریب قریب غالب کی ساری رقعے اردو اور فارسی نثر کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام اور رالف رسل کی ایک اور کتاب THREE MUGHAL POETS بھی شائع ہوئی ہے اس کتاب میں میر، سودا اور میر حسن کا مفصل مطالعہ ہے۔ اس کا ایک اڈیشن ہارورڈ یونیورسٹی پریس سے چھپا ہے اور دوسرا اڈیشن جارج الین اینڈ انون نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن کا ترتیب دیا ہوا "کلیات جرأت" فیکلٹی آف آرٹس کی طرف سے چھپ رہا ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر کی غالب کی ببلیوگرافی جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔ شعبہ اردو کے استاد شہریار کا دوسرا مجموعہ "ساتواں در" زیر طبع ہے۔ بشیر بدر صاحب کی (جو شعبہ اردو کے ریسرچ سکالر ہیں) غزلوں کا مجموعہ "اکائی" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

اس میگزین کی تکمیل میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کی خصوصی عنایت کا بہت دخل ہے۔ آپ نے نہ صرف نگرانی کی بلکہ ہر طرح سے میری مدد اور رہنمائی کی۔ آپ کی بزرگانہ شفقت اور محبت نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے اس پر ناز ہے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کا ہمیشہ شکر گذار اور احسانمند رہوں گا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اور جناب شہریار صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ہمت افزائی کی۔ علی گڑھ میگزین کے سابق ایڈیٹر بشیر بدر صاحب بھی اس شمارے کے لیے نہایت خلوص اور ہمدردی کے ساتھ مدد کرتے رہے ہیں میں ان کا بھی بہت شکر گزار ہوں۔

آخر میں اس شمارے کی مجلس ادارت کے ارکان شمیم فاطمہ خاں اور شاہدہ صدیقی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے کتابت سے لے کر پروف پڑھنے تک ہر منزل اور مرحلے پر میری مدد کی۔

عنایت حسین عیدن

پروفیسر آل احمد سرور

میں اپنے سفر کی ابتدا کو یاد کرتا ہوں تو مشہور امریکن شاعر رابرٹ فروسٹ کی یہ سطریں ذہن میں آ جاتی ہیں :

Some where ages and ages hence,
Two roads diverged in a wood, and I
Took the one less travelled by
And that has made all the difference,

میں بدایوں کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوا۔ والدہ بتاتی تھیں کہ میری پیدائش منجھلے روزے کے بعد دو بجے شب کو ہوئی تھی۔ اس حساب سے آخر اگست ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوا۔ میرے والد ڈاک خانے میں ملازم تھے اور باہر رہتے تھے میری والدہ زیادہ تر میکے میں رہتی تھیں۔ میں اکثر ننہال اور کبھی کبھار ددھیال میں رہتا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے بسم اللہ پڑھائی اپنے ایک ماموں کے مکتب میں، میں نے اردو اور قرآن شریف شروع کیا۔ مولوی صاحب بزرگوں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں کہانیاں سناتی تھیں۔ ہمارے گھر میں بیت بازی کا بہت رواج تھا جس میں گھر کی عورتیں اور بچے سب ہی حصہ لیتے تھے۔

میں ہمعصروں کے کھیلوں، اونچا نیچا، گلی ڈنڈا اور کبھی کبھی جرمنی اور انگلستان کی لڑائی میں شریک ہوتا مگر زیادہ دلچسپی بڑوں کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سننے میں تھی۔ اس زمانے میں بدایوں میں خلافت تحریک کا بڑا زور تھا۔ جامع مسجد میں روز جلسے ہوتے تھے۔ شہر میں لیڈروں کے جلوس نکلتے۔ ان جلسوں میں ضرور شریک

ہوتا۔ ایک دفعہ ایک دوست کے ساتھ عورتوں سے ایک ایک پیسہ چندہ کرکے ایک روپیہ جمع کیا اور محلے کے کارکن کو دے دیا کتنی ہی نظمیں یاد کرلی تھیں، میں نے اردو پڑھنے کے بعد فارسی شروع کی مگر گلستاں کے چند باب پڑھ پایا تھا کہ انگریزی کی طرف موڑ دیا گیا اور کنگ ریڈر شروع کرادی گئی۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھنے کا شوق بہت چھوٹی عمر میں ہوگیا تھا۔ آٹھ نو سال کی عمر میں میرا نام پیلی بھیت کے انگریزی اسکول میں لکھادیا گیا۔ اب ہمارا سارا گھر پیلی بھیت منتقل ہوگیا۔ اس وقت ہم چار بہن بھائی تھے۔ والد کو دفتر اور والدہ کو گھر سے فرصت نہ ملتی۔ بڑے بھائی بہن مجھ سے بڑے تھے۔ چنانچہ میں اپنا وقت دفتر کے کلرکوں، چپراسیوں اور کبھی کبھا۔ والد کے ملنے والوں کے ساتھ گذارا کرتا۔ اس زمانے میں والدصاحب کوار دو یا انگریزی کی کوئی کتاب ضرور پڑھتے تھے۔ میں بھی چوری چھپے اسے ضرور پڑھا کرتا تھا۔ اس پر پٹا بھی مگر یہ عادت گئی نہیں۔ جب میں پانچویں درجے میں تھا اور امتحان سر پر آگیا تھا تو میں ایک دن فسانۂ آزاد پڑھتے ہوئے پکڑا گیا۔ خوب مرمت ہوئی۔ والد نے بہت ڈانٹا کہ امتحان سر پر ہے اور یوں وقت خراب کیا جارہا ہے مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جو چیز ایک دفعہ کلاس میں پڑھ لی ہے اور یاد ہوگئی ہے اسے پھر کس طرح پڑھا جائے۔ ایک دفعہ سنیچر کے دن ایک ماسٹر نے کہا کہ پیر کو آموختہ سُنا جائے گا اور پورا سبق دو دفعہ پڑھ لیا جائے۔ پیر کو امتحان ہوا میں نے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔ پوچھنے پر بتایا کہ ایک دفعہ سبق پڑھا تھا۔ ماسٹر نے اس بات پر مارا کہ جب دو دفعہ پڑھنے کو کہا تھا تو ایک دفعہ کیوں پڑھا۔ لطف یہ ہے کہ ایک دفعہ بھی نہیں پڑھا تھا اور ڈر کے مارے جھوٹ بولا تھا مگر پٹائی سے نہ بچ سکا۔ یاد پڑتا ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں مراۃ العروس، توبۃ النصوح، الف لیلہ اور اس قسم کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ

گرمیوں کی چھٹیوں میں طلسم ہوش ربا کی کئی جلدیں اور تاریخ ابن خلدون کے کئی حصے مل گئے۔ میرا بُرا حال تھا کبھی ایک کو صبح سے دوپہر تک، پڑھتا تھا کبھی دوپہر سے شام تک دوسری کو، کچھ سمجھتا تھا، کچھ نہیں مگر پڑھ سب جاتا تھا۔ پانچویں درجے سے کچھ ایسا اتفاق ہوتا کہ اسکول ڈاک خانے سے ڈیڑھ دو میل دور ہوتا۔ میں پیدل جایا کرتا تھا کبھی کوئی ساتھ ہوتا کبھی نہیں۔ گھر سے نکلا اور خیالی پلاؤ پکانا شروع کیا، کبھی بادشاہ بنتا، کبھی سپہ سالار، کبھی باغی، کبھی مصنف، اس طرح بغیر فاصلے کی دوری یا دھوپ کی تمازت محسوس کیے، اسکول یا گھر پہنچ جاتا۔ خیالی پلاؤ پکانے کی یہ عادت اب کم ہو گئی ہے مگر چھوٹی نہیں۔ لطف یہ ہے کہ ایک ذہنی تصویر سے طبیعت اُکتائی، اُسے ہٹا کر دوسری بنانی شروع کر دی۔

کلاس میں ہر مضمون میں اچھا رہا سوائے حساب کے جو ہمیشہ کمزور رہا۔ ساتویں آٹھویں درجے ہی میں، میں اردو خاصی لکھ لیتا تھا۔ شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ انگریزی اخبار کے مطالعے کا شوق ہو چکا تھا۔ اردو اخبار مدینہ برابر پڑھتا تھا انگریزی اخبار کی سرخیاں دیکھا کرتا تھا۔ بانگ درا کی بہت سی نظمیں یاد تھیں فانی کی غزلیں جھوم جھوم کر پڑھتا تھا۔ جلسوں میں شرکت ضرور کرتا تھا۔ کوئی قومی رہنما شہر میں آتا تو اس کی تقریر سننے ضرور جاتا۔ آٹھویں درجے میں تھا کہ علی گڑھ میں کالج کی جوبلی کی تقریب ہوئی۔ والد کی خوشامد کر کے ان کے دوستوں کے ساتھ غازی پور سے علی گڑھ آیا۔ افتتاحی اجلاس کی شان و شوکت، سیّدین کی ایک مباحثے میں تقریر، مشاعرے کا منظر آج تک یاد ہے۔ اسکول کا زمانہ زیادہ تر سیتاپور، گونڈے اور غازی پور میں گذرا۔ ہائی اسکول کا امتحان میں نے بنارس سے دیا۔ خوب یاد ہے کہ ہم کئی لڑکے تھے جو دن بھر پڑھتے تھے اور شام کو بنارس کی گلیوں اور گھاٹوں کی سیر کرتے تھے۔ اس کے بعد چچا کے

پاس آگرے بھیج دیا گیا۔ یہاں سینٹ جانس کالج میں فرسٹ ایر سائنس میں نام لکھا یا گیا۔ والدین کا خیال تھا کہ ڈاکٹری سکھائیں، مجھے سائنس سے دلچسپی نہ تھی مگر بغاوت کی بھی ہمت نہ تھی۔ انگریزی، اردو ادب اور معلومات عامہ کی کتابیں پڑھتا تھا مگر سائنس کا اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ کالج کی یونین میں، سائنٹفک سوسائیٹی اور اردو سوسائیٹی میں برابر شریک ہوتا تھا۔ تقریر کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔ مجمع کے سامنے جانے میں مجھے ہمیشہ گھبراہٹ معلوم ہوتی تھی مگر میں اس گھبراہٹ پر قابو پانے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا۔ کالج میگزین میں، میری غزلیں، نظمیں اور مضامین شائع ہوتے رہے۔ سائنس کے طالب علم انگریزی میں نیازمند اور معلومات عامہ میں کورے سمجھے جاتے تھے۔ میں فرسٹ ایر میں آرٹس، سائنس، کامرس میں انگریزی میں فرسٹ آیا اور معلومات عامہ میں آرٹس، سائنس، کامرس میں فرسٹ ایر سے فورتھ ایر تک کے سارے طلبا میں سب سے زیادہ نمبر پائے۔ ہمارے ڈین فیکلٹی آف سائنس ڈاکٹر پانڈیا خوشی کے مارے اتنے بے حال ہوئے کہ کالج کی اسٹاف میٹنگ میں آرٹس اور کامرس کے اساتذہ کو طعنے دینے لگے۔ اس زمانے میں، میں نے ہارڈی کے بہت سے ناول پڑھے اور اب تک یاد ہے کہ Jude the Obscure پڑھ کر میں بے اختیار رونے لگا تھا ایف۔ایس سی میں سکنڈ کلاس ملا تو میں نے چاہا کہ آرٹس میں داخلہ لے لوں مگر والد نے بی۔ایس سی کرنے کا مشورہ دیا۔ بی۔ ایس سی میں تھیوری میں فرسٹ کلاس نمبر آئے مگر پریکٹیکل میں کم آنے سے کچھ نمبر سے فرسٹ کلاس رہ گیا تو سائنس چھوڑنے کا قطعی ارادہ کر لیا اور علی گڑھ پہنچ کر انگریزی میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ میں ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آیا۔ یہ راس مسعود کی وائس چانسلری

کا زمانہ تھا چونکہ میرے والد کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تھا۔ اس لیے ایک سال انھیں کے پاس رہا۔ دوسرے سال جب میں یونین کا نائب صدر ہوا تو ایس۔ ایس ایسٹ ہوسٹل میں منتقل ہو گیا۔ ایم۔ اے پریویس میں مجھے 'علی گڑھ میگزین' کا اڈیٹر بنا دیا گیا۔ میں نے ۱۹۳۳ء میں چار شمارے نکالے جن میں ایک سالنامہ بھی تھا۔

۱۹۳۴ء کے اکتوبر سے میں شعبۂ انگریزی میں لیکچرر ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں رشید صاحب کے ساتھ سہیل کا ایک ضخیم نمبر نکالا۔ ۱۹۳۴ء میں آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں بیٹھنے کا خیال تھا مگر ذاکر صاحب نے معلمی کے پیشے کی اہمیت واضح کی تو یہ خیال ترک کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے مشورہ دیا کہ انگریزی میں تخلیقی کام یا بڑا تنقیدی کام نہیں ہو سکتا، تم اردو کے لیے اپنے کو وقف کر دو، چنانچہ ۱۹۳۶ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا اور جولائی ۱۹۳۶ء سے میری خدمات شعبۂ اردو کو منتقل کر دی گئیں۔ اگست ۱۹۳۶ء میں میری شادی ہوئی۔ پہلے میرا تقرر جونیر لیکچرر کی حیثیت سے ہوا تھا جب ۱۹۳۸ء میں مولانا احسن مارہروی ریٹائر ہوئے تو سینیر لیکچرر مقرر ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں میری شاعری کا ایک چھوٹا سا مجموعہ 'سلسبیل' کے نام سے شائع ہوا تھا اور نیاز فتحپوری، اصغر گونڈوی، پطرس بخاری نے اُسے سراہا تھا۔ اس کے بعد زیادہ توجہ تنقید کی طرف رہی۔ ۱۹۴۱ء میں تنقیدی اشارے کے نام سے میری ریڈیائی تقریروں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا جس کا ملک میں عام طور پر گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو میں بڑا اچھا ریویو لکھا۔ ۱۹۴۴ء میں انجمن نے انتخاب جدید کے نام سے میرا اور عزیز احمد کا ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۲ء تک کی اردو شاعری کا انتخاب شائع کیا۔ ۱۹۴۵ء میں ذاکر صاحب کے مشورے سے میں رضا انٹر کالج رامپور کے پرنسپل کی حیثیت

سے رام پور چلا گیا۔ وہاں ڈیڑھ سال گزرا تھا کہ مولوی عبدالحق کی سفارش پر میرا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر کی حیثیت سے ہو گیا۔ لکھنؤ میں میرا قیام ۱۹۵۵ء کے آخر تک رہا۔

لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں میرے تنقیدی مضامین کے حسب ذیل مجموعے شائع ہوئے :۔

(۱) نئے اور پرانے چراغ (۱۹۴۶ء)

(۲) تنقید کیا ہے ؟ (۱۹۴۷ء)

(۳) ادب اور نظریہ (۱۹۵۴ء)

۱۹۵۵ء میں میری شاعری کا دوسرا مجموعہ ذوقِ جنوں شائع ہوا۔

۱۹۵۵ء کے آخر میں میرا تقرر سید حسین ریسرچ پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہوا اور دیوان غالب کے انگریزی میں ترجمے کی خدمت میرے سپرد کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک فیلو دیا گیا تاکہ اس سے نول کشور کی ادبی خدمات پر مقالہ تیار کراؤں۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سبکدوش ہونے پر، پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اگست ۱۹۶۰ء میں مجھے حکومت ہند نے بین الاقوامی مستشرقین کانگرس کے پچیسویں اجلاس ماسکو کے لیے وفد کا ممبر نامزد کیا۔ ماسکو کی کانگرس میں میں نے "آزادی کے بعد اردو ادب" پر ایک مقالہ پڑھا۔ لینن گراڈ بھی گیا۔ سوویٹ یونین میں میرا قیام پندرہ دن رہا۔

جنوری ۱۹۵۶ء سے انجمن ترقی اردو ہند کا جنرل سکریٹری ہوں اور اخبار ُہماری زبان' اور رسالہ ُاردو ادب' کی ادارت بھی میرے سپرد ہے۔

جون ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند نے ایک ترجمہ سیمینار کے لیے کابل بھیجا۔

یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء تک شکاگو یونیورسٹی میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور امریکہ کی کئی ممتاز یونیورسٹیوں میں اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر لیکچر دیے۔ فی الحال غالب اور اقبال پر انگریزی میں دو کتابوں کی تیاری میں مصروف ہوں۔ اردو میں تنقیدی مضامین کے دو مجموعے بھی زیر ترتیب ہیں۔ ذوقِ جنوں کی اشاعت کے بعد جو کچھ کہا ہے اس کا ایک انتخاب عنقریب پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس میں نظمیں اور غزلیں دونوں ہیں۔ میرا اور میری شاعری کا معاملہ حسرت کے محبوب کا سا ہے ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

○

سب سے بیگانگی نہ آشنا نا آشنا
آج دنیا میں نہیں کوئی کسی کا آشنا

یا حیاتِ نو سے ہے معصوم کلیوں کو حجاب
یا کشودِ کار سے بادِ صبا نا آشنا

ان بڑے شہروں میں انسانوں کی تنہائی نہ پوچھ
"سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا"

ساتھ دینا وقت کا بھی کیا قیامت ہو گیا
کل تلک جو آشنا تھے آج ہیں نا آشنا

دوسرے کے درد کا محرم کوئی کیا ہو سرور
آدمی جب ہو سکا اب تک نہ اپنا آشنا

گرچہ خارِ دشت تلووں سے الجھتا جائے ہے
کچھ چمن بندی کے ارماں پر تو رنگ آ جائے ہے

سر قدم پہ خود ہی دیتی ہے بڑھاوا چشمِ دوست
عاشقی کا بار کب تنہا اٹھایا جائے ہے

تازہ تر رنگِ جہاں ہے، طرفہ تر حسنِ بتاں
یہ مرا خونِ جگر کچھ کام تو آ جائے ہے

اس کی قامت پر ابھی موزوں نہیں ہے یہ لباس
آدمی گو عقل کے سانچے میں ڈھلتا جائے ہے

کچھ نہ کچھ جذب و جنوں کا بھی سہارا ہے ضرور
یوں حقائق کا علم کس سے اٹھایا جائے ہے

زندگی کے زخم گویا شاعری کے پھول ہیں
یہ چراغ اکثر لہو سے بھی جلایا جائے ہے

یادِ ماضی کی ترنگیں، فکرِ فردا کے طلسم
آدمی اب بھی کھلونوں سے بہلتا جائے ہے

یاد آتا ہے کوئی صحنِ چمن یا بامِ دوست
دیر تک کس سے فضاؤں میں بھی ٹھہرا جائے ہے

ہے یہ داغوں کا کرشمہ یا تصور کا کمال
کچھ نہ کچھ شب کا اندھیرا تو پگھلتا جائے ہے

اک اشارے کی بلاغت داستاں سے کم نہیں
کم نگاہی میں بھی کیا کیا رمز پایا جائے ہے

روز خوابوں اور حقائق میں ہوا کرتی ہے جنگ
دل ہے دیوانہ ہمالہ سے بھی ٹکرا جائے ہے

○

کہنے کو یہ آبادی ہے، کہنے کو یہ بستی ہے
ہم کو یہ آبادی بھی ویرانہ بن کر ڈستی ہے

پھیلا اک عالم میں اجالا کرنوں نے کیا کھیلے کھیل
اب تک یہ سایوں کی وادی اک سورج کو ترستی ہے

فکر کی طغیانی بھی دیکھی، جذبے کی جولانی بھی
بے مصرف سا شعلہ ہے یا بے معنی سی مستی ہے

قطرے کو سب پی جاتے ہیں، دریا کی ہے بات کچھ اور
اتنی اس کی پرستش ہوگی جتنی جس کی مستی ہے

پھولوں تک جو ہاتھ بڑھے انگاروں سے بچ نہ سکے
ہر پھولوں کی وادی یاں کانٹوں کی بھی بستی ہے

ان کی اک بیگانہ نظر نے گاہک ہم میں ٹٹولے ہیں
میرے خونِ جگر کی دولت سستی تھی سو سستی ہے

صبحِ بہاراں کا جادو، زلفِ نگاراں کی خوشبو
کچھ فطرت کا تحفہ ہے باقی فکر کی مستی ہے

آندھی سے کیوں ڈرتے ہو گرد بھی باراں لاتی ہے
کل صہبا بھی برسے گی، گو اب آگ برستی ہے

جو ایماں مغرور بنائے، اپنی ذات سے عشق سکھائے
اس ایماں سے بہتر یارو میری کفر پرستی ہے

لو اندھیروں نے بھی انداز اُجالوں کے لیے
کیسی افتاد پڑی دیکھنے والوں کے لیے

تازہ کاری نے زباں کر دیے عالم ایجاد
ہم ترستے ہی رہے تازہ خیالوں کے لیے

شاہراہوں سے گذرتے ہیں شب و روز ہجوم
نئی راہیں ہیں فقط چند خیالوں کے لیے

کام ماضی کی یہ سادہ نگہی کیا آتی
عصرِ حاضر ترے پیچیدہ سوالوں کے لیے

کتنی شمعیں بجھیں نادیدہ کرن کی خاطر
کتنے سورج لُٹے موہوم اجالوں کے لیے

کتنے سنگین حقائق سے نچوڑا ہے لہو
چند خوابوں کے لیے چند خیالوں کے لیے

گو نگہ داریِ آدابِ جنوں مشکل ہے
پھر بھی آساں ہے ترے چاہنے والوں کے لیے

یہ دور مجھ سے خرد کا وقار مانگے ہے
دل اب بھی شوق کے سیل و نہار مانگے ہے

جہاں میں کس کو گوارا ہوئی ہے فکر کی دھوپ
ہر اک کوئی شجر سایہ دار مانگے ہے

زبان لالہ و گل میں بسی ہوئی ہے مگر
زمانہ لفظ میں خنجر کی دھار مانگے ہے

اکیلے پن کا یہ احساس، ہم نفس کی تلاش
بڑھی ہوئی یہ جو تلخی ہے، پیار مانگے ہے

یہ آدمی مرے خوابوں کا ساتھ کیا دیتا
حقیقتوں سے جو اکثر فرار مانگے ہے

اب ان میں اپنا لہو ہو کہ کوئی شوخ کرن
ورق جو سادہ ہے نقش و نگار مانگے ہے

ہوا کہاں ابھی صدیوں کے جبر سے آزاد
خدائی پر جو بشر اختیار مانگے ہے

بھکاریوں کو یہاں بھیک کون دیتا ہے
بے سادہ لوح، جو دنیا سے پیار مانگے ہے

وہ دیدہ ور جسے پہچانتی نہیں محفل
تری نظر سے فقط اعتبار مانگے ہے

زنجیر سے جنوں کی خلش کم نہ ہو سکی
بھڑکی اگر یہ آنچ تو مدھم نہ ہو سکی

بدلے بہارِ لالہ و گل نے ہزار رنگ
لیکن جمالِ دوست کا عالم نہ ہو سکی

کیا کیا غبار اٹھائے نظر کے فساد نے
انسانیت کی لو کبھی مدھم نہ ہو سکی

ہم لاکھ بدمزہ ہوئے جامِ حیات سے
جینے کی پیاس تھی کہ کبھی کم نہ ہو سکی

جو جھک گئی جبیں ترے نقشِ قدم کی سمت
تا زیست پھر وہ اور کہیں خم نہ ہو سکی

مجھ سے نہ پوچھ، اپنی ہی تیغِ ادا سے پوچھ
کیوں تیری چشمِ لطف بھی مرہم نہ ہو سکی

کتنے رموزِ شوق ان آنکھوں میں رہ گئے
جن سے نگاہِ دوست بھی محرم نہ ہو سکی

موجِ نسیم اپنی بہاریں لٹا گئی
لیکن خزاں کی مردہ دلی کم نہ ہو سکی

اللہ رے اشتیاق نگاہِ امید کا
کھوئے ہوؤں کی یاد میں پُرنم نہ ہو سکی

گل کاریٔ نظر ہو کہ رنگِ جمالِ دوست
کچھ بات تھی کہ زیست جہنم نہ ہو سکی

ان کی جبیں پہ خیر سے اک رنگ آ گیا
میری وفا اگرچہ مسلّم نہ ہو سکی

اپنے ہی گھر کی خیر منائی تمام عمر
ہم سے سرورِ فکرِ دو عالم نہ ہو سکی

خوابوں سے یوں تو روز بہلتے رہے ہیں ہم
کتنی حقیقتوں کو بدلتے رہے ہیں ہم

اپنے غبار میں بھی ہے وہ ذوقِ سرکشی
پامال ہو کے عرش پہ چلتے رہے ہیں ہم

سو سو طرح سے تجھ کو سنوارا ہے حسنِ دوست
سو سو طرح سے رنگ بدلتے رہے ہیں ہم

ہر دشت و در میں پھول کھلانے کے واسطے
اکثر تو نوکِ خار پہ چلتے رہے ہیں ہم

آئینِ پاس داریِ صحرا نہ چھٹ سکا
وضعِ جنوں اگرچہ بدلتے رہے ہیں ہم

ساقی نہ ملتفت ہو تو پینا حرام ہے
پیاسے بھی میکدے سے نکلتے رہے ہیں ہم

کوئی خلیل جس کو نہ گلزار کر سکا
تیرے لیے اس آگ پہ چلتے رہے ہیں ہم

کیا جانے کب وہ صبحِ بہاراں ہو جلوہ گر
دورِ خزاں میں جس سے بہلتے رہے ہیں ہم

پرسانِ حال کب ہوئی وہ چشمِ بے نیاز
جب بھی گرے ہیں خود ہی سنبھلتے رہے ہیں ہم

ساحل کی عشرتوں کو خبر بھی نہ ہو سکی
طوفان بن کے لاکھ مچلتے رہے ہیں ہم

تخئیل لالہ کار یہ کہتی ہے اے سرور
کوئی زمیں ہو پھولتے پھلتے رہے ہیں ہم

دلدادگانِ لذتِ ایجاد کیا کریں
سیلابِ اشک و آہ پہ بنیاد کیا کریں

کرنا ہے جن کو تازہ نہالوں کی دیکھ بھال
بیتی ہوئی بہار کو وہ یاد کیا کریں

ہاں جان کر امید کی مدھم رکھی ہے لَو
اب اور پاسِ خاطرِ ناشاد کیا کریں

سنگیں حقیقتوں سے کہاں تک ملول ہیں
رعنائیِ خیال کو برباد کیا کریں

دیکھو جسے، لیے ہے وہ زخموں کی کائنات
ہم ایک اپنے زخم پہ فریاد کیا کریں

رندوں کی آرزو کا تلاطم کہاں سے لائیں
آسودگانِ مسندِ ارشاد کیا کریں

کس کو نہیں سکون کی خواہش جہان میں
افتادگانِ رہگذر یاد کیا کریں

جو ہر نظر میں تازہ کریں میکدے ہزار
ہیچ ہے سرورِ رفتہ کو وہ یاد کیا کریں

شگفتگیِ دلِ ویراں میں آج آ ہی گئی
گھٹا چمن پہ بہاروں کو لے کے چھا ہی گئی

حیاتِ تازہ کے خطروں سے دل دھڑکتا تھا
ہوا چلی تو کلی پھر بھی مسکرا ہی گئی

نقاب میں بھی وہ جلوے نہ قید ہو پائے
کرن دلوں کے اندھیرے کو جگمگا ہی گئی

تغافل ایک بھرم تھا غرورِ جاناں کا
مری نگاہ، محبت کا رمز پا ہی گئی

مطالبے تو بہت سخت تھے زمانے کے
مگر حقوقِ محبت کی یاد آ ہی گئی

مرے جنوں کی خلش سے اب اور کیا ہوتا
سکوتِ اہلِ خرد کو تو آزما ہی گئی

متاعِ قلب و نظر خاک ہونے ہوتے بھی
جہانِ حسن کی کچھ آبرو بڑھا ہی گئی

تھپک تھپک کے سلایا جو تم نے ذوقِ سخن
سرور اس کو کسی کی نظر جگا ہی گئی

○

خیال جن کا ہمیں روز و شب ستاتا ہے
کبھی انھیں بھی ہمارا خیال آتا ہے

تمھارا عشق جسے خاک میں ملاتا ہے
اسی کی خاک سے پھر پھول بھی کھلاتا ہے

ڈھلے گی رات تو پھیلے گا نور بھی اُس کا
چراغ اپنا سرِ شام جھلملاتا ہے

نہ طے ہوئی تری شمعِ جمال سے جو راہ
وہیں یہ میرا جنوں راستہ دکھاتا ہے

نہ جانے شوق کو عادت ہے کیوں بہکنے کی
ترا حجاب تو بے شک ادب سکھاتا ہے

کہاں بجھائے سے بجھتے ہیں عشق کے شعلے
چراغ یوں تو جو جلتا ہے، بجھ بھی جاتا ہے

یہ بادِ راہ گزر ہے، خوشبوئے چمن نہ سہی
غبار کا بھی ٹھکانا نکل ہی آتا ہے

جنوں کی چال پہ ٹھٹکی نہ وہ نظر تنہا
یہاں زمانہ بھی قدموں میں لوٹ جاتا ہے

ہے تیرے غم کی غمِ روزگار سے سازش
کہاں کہاں دلِ دیوانہ کام آتا ہے

سرورِ جنسِ وفا بیچتے نہیں پھرتے
جگر کے داغ دکھانا تو سب کو آتا ہے

ہر اک جنت کے رستے ہو کے دوزخ سے نکلتے ہیں
انھیں کا حق ہے پھولوں پر جو انگاروں پہ چلتے ہیں

حقائق ان سے ٹکرا کر نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں
بڑے ہی سخت جاں ہوتے ہیں جو خوابوں پہ پلتے ہیں

گماں ہوتا ہے جن موجوں پہ اک نقشِ حبابی کا
انھیں سوئی ہوئی موجوں میں کچھ طوفان پلتے ہیں

وہ رات آخر ہوئی تو کیا، یہ دن کب رہنے والا ہے
ستارے ماند ہوتے ہیں اگر سورج بھی ڈھلتے ہیں

تلوّنِ چشمِ ساقی میں، تغیرِ وضعِ رندی میں
ہمارے میکدے میں روز پیمانے بدلتے ہیں

حقائق سرد ہو سکتے ہیں سب محراب و منبر کے
مگر وہ خواب، جو رندوں کے پیمانے میں ڈھلتے ہیں

جنوں نے عالمِ وحشت میں جو راہیں نکالی ہیں
خرد کے کارواں آخر انھیں راہوں پہ چلتے ہیں

سرو، سادہ کو یوں تو لہو رونا ہی آتا ہے
مگر اس سادگی میں بھی بڑے پہلو نکلتے ہیں

ایک دیوانے کو اتنا ہی شرف کیا کم ہے
زلف و زنجیر سے یک گونہ شغف کیا کم ہے

شوق کے ہاتھ بھلا چاند کو چھو سکتے ہیں
چاندنی دل میں رہے یہ بھی شرف کیا کم ہے

کون اس دور میں کرتا ہے جنوں سے سودا
تیرے دیوانوں کی ٹوٹی ہوئی صف کیا کم ہے

آگ بھڑکی جو ادھر بھی تو بجھے گی کیا شے
شعلۂ شوق کی لو ایک طرف کیا کم ہے

میں نے ہر موج کو موجِ گزراں سمجھا ہے
ورنہ طوفانوں کا رخ میری طرف کیا کم ہے

کالی راتوں میں اجالے سے محبت کی ہے
صبح کی بزم میں اپنا یہ شرف کیا کم ہے

شعلے کا رقص

ذرّہ ذرّہ شیشۂ ساعت سے کم ہوتی ہے ریت
قطرہ قطرہ جذب ہوتا ہے بیاباں میں لہو
ریت کم ہو پھر بھی ہے اس پر کرم خورشید کا
قطرہ کھو جائے مگر بجھتی تو ہے صحرا کی پیاس
مرحبا وضع محبت، آخرش سعیٔ جنوں
ہر حقیقت سے سہانا اس کے خوابوں کا فسوں

وقت کے دریا میں موجوں کا نہیں کوئی شمار
کوئی نغمہ، کوئی طوفاں، کوئی آنسو، کوئی آگ
سب فنا انجام، لیکن کچھ بقا آموز بھی
سب سکوں کی جستجو میں، کچھ مگر محشر بدوش
دیکھنا یہ ہے کہ ہے کس موج سے دریا کی لاج
کس کی شورش سے نگوں سر ہو گیا ساحل کا تاج

کوئی شعلہ جب بہ فورِ شوق میں کرتا ہے رقص
اس کا جوہر آزماتے ہیں خس و خاشاک بھی
آندھیاں آتی ہیں اکثر پرسشِ احوال کو
تیر بارش کے کیا کرتے ہیں پیہم چھیڑ چھاڑ
پھر بھی یہ شعلہ چراغِ محفلِ ہستی تو ہے
بیدلی کی گرد میں آئینۂ مستی تو ہے

متفرقات

ٹوٹا بکھرا ہوا ہے خوابوں کے نازک آبگینے پہ
ہزاروں ظلمتوں میں اک کرن کی آرزو ہے

گزرے گا اس طرف سے بھی بہاروں کا قافلہ
چھڑکا ہو خونِ جگر جہاں [illegible]

کھلی فضا سے مجھے عزیز ہے پر اس کا کیا کروں
بچھا ہوا زمیں سے آسماں تک اک جال سا ہے

رنگ پھولوں میں بہت عام ہے لیکن اے دوست
پھول کانٹوں میں کھلائے وہ جنوں تا ہے

کرنا ہے اپنے کام و دہن کا بھی امتحاں
زہرِ حیات جان کے چکھنا بھی چاہیے

یہ بھی زمانہ جرم سمجھتا ہے عشق کو
یہ جرم گاہ گاہ تو کرنا بھی چاہیے

مانا کہ تم کو اپنی بلندی پہ ناز ہے
دل میں کبھی کسی کے اترنا بھی چاہیے

بربادیٔ چمن میں ہمارا بھی ہاتھ ہے
اس راز سے بتاؤ کسے آشنا کریں

اندھیری رات میں جیسے کوئی جگنو چمک اٹھے
بس اتنا ہی سکونِ خاطرِ ناشاد ہوتا ہے

گو مری نظر سے بھی چاندنی ہے دنیا میں
پر ترے تبسم سے اس کو کم تو رکھنا تھا

جو ماضی کی سوئی ہوئی بستیاں ہیں، نہ اب نور ان میں نہ اب راگ ان میں
یہ مانا وہ عالم بھی تھا ایک عالم، مگر اب وہ خوابوں کا عالم کہاں تک

ترے بغیر وہ راتیں بھی کاٹ دیں ہم نے   کہ جن میں تیرا تصور بھی رہنما نہ ہوا

ادا ادا میں ہے رنگینیوں کا اک طوفاں   اگرچہ کہنے کو وہ وضع سادہ رکھتے ہیں

بڑی ہی اک امید پہ جیتے رہے سرور   ہم سادہ لوح حسن کی باتوں میں آ گئے

ہمارا خاک میں ملنا بھی کام آ ہی گیا   غبار ہو کے ستاروں کے راز داں ٹھہرے

جبیں پہ سایہ [illegible] مگر بھی تو بہشت کو کیا کیے   ترا درِ حبیب پایا ہم [illegible] ہی [illegible] آئے

وہی تھی داد تشنہ لبی جس غریب کو   وہ بزم میں نہیں ہے [illegible]

جب سرور ان کی یاد آتی ہے   شعر کہنے سے جی بہلتا ہے

سرِ حضرتِ انساں کا راز فاش نہیں
کہ آدمی کا ابھی آدمی سے پردہ ہے

ڈاکٹر خورشید الاسلام



خورشیدالاسلام اور رالف رسل

میں ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوا۔ میرے والد اختر جمیل صاحب مرحوم ریاست رامپور میں ایک اچھے عہدہ پر مامور تھے۔ گھر میں زمینداری بھی تھی اور میں اکلوتا لڑکا تھا۔ لیکن ابھی ۵ برس ہی کا تھا کہ ابا کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ میرے لیے آج بھی تازہ ہے۔ دادا دو سال تک اور اس دنیا میں رہے۔ فارسی کے عالم تھے، ان کی وجاہت جلال اور شفقت کا دل پر بہت گہرا اثر ہے۔ انھیں پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ابا کے انتقال کے بعد، انھوں نے جس طرح میری تربیت کی، میں اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں خلیفۃ المسلمین ہونے والا ہوں۔ مجھے ان کی محبت اور ڈسپلن دونوں سے وحشت ہونے لگی۔ جی چاہتا تھا کہ بچوں کے کے ساتھ کھیلوں، ہنسوں یا روؤں لیکن تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ بہرحال سات برس کی عمر تک میں نے قرآن شریف کے علاوہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتابیں اور گلستاں بوستاں اور حکایاتِ لطیف پڑھ ڈالیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مجھے علم یا ادب سے کوئی شغف ہے یا میرے اندر کوئی ذوق ہے تو وہ سب میرے دادا کی دین ہے۔ گیارہ برس کی عمر تک، پتہ نہیں کیا کیا پڑھ ڈالا۔ تین کتابیں بے حد پسند آئیں، باغ و بہار، آرائش محفل اور قصص الانبیاء۔ راز کی بات یہ ہے کہ زہر عشق بھی پڑھ ڈالی۔ سمجھتا تو کیا خاک، لیکن یہ حصہ حفظ ہو گیا کہ جائے عبرت سرائے فانی ہے یہ شعر رہ رہ کے نہ جانے کیوں دل میں چبھتا تھا کہ

یاد اپنی تمھیں دلاتے جائیں ۔۔۔ یاں کل کے لیے لگاتے جائیں

اسی زمانہ میں ایک روز الہام ہوا اور بفضلہٖ ایک غزل سرانجام ہوئی جس کا ایک شعر اب بھی یاد ہے اور وہ یہ ہے ؎

حالِ دل پوچھتے ہیں جب وہ مرا　　عرض کرتا ہوں مہربانی ہے

کیا زمانہ تھا۔ اب جو اگلی زندگی کی تصویریں یاد آتی ہیں تو ابا کا کتابی چہرہ اور پُرسکون مگر بولتی ہوئی روشن آنکھیں، دادا کا پُرانی لباس اور طنطنہ اور کتب بینی، ماں کی غیر معمولی خودداری، ایثار اور سُرخ وسپید چہرہ، — یہ سب یوں نظر آتے ہیں جیسے نہ میں بدلا ہوں، نہ زمانہ بدلا ہے، نہ یہ لوگ کہیں اور گئے ہیں۔ یہیں تھے، یہیں ہیں۔

ابا کے انتقال کے بعد، والدہ نے قسم کھائی کہ آج سے نہ کسی عزیز کے یہاں جائیں گی، نہ کسی تقریب میں شریک ہوں گی۔ میرا خاندان، قاضیوں کا ہے جو بجنور میں ہر اعتبار سے محترم رہا ہے۔ ان اعتبارات میں خوش حالی بھی ہے۔ لیکن ہماری ماں نے، ہمارے اندر کوئی ایسی بات پیدا کر دی کہ خواہش عفت پہ قانع ہو گئی۔ میں ادب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی بھر، نہ کسی امیر سے مرعوب ہوا ہوں اور نہ کسی کی امارت کو خاطر میں لایا ہوں۔ غربت کی صعوبتیں جھیلی ہیں اور فراغت کے ذائقے چکھے ہیں۔ لیکن غربت میں سربلند رہا ہے اور فراغت میں کبھی وہ سیری نہیں ہوئی کہ دل سخت ہو جائے اور مسکین، حقیر ہو جائیں۔ گیارہ برس کی عمر میں دہلی پہنچا۔ ایک سال تکلیف اور تنہائی کا ایسا دیکھا کہ دنیا نظر میں تاریک ہو گئی۔ اس عالم میں خدا سے دل لگایا۔ اور ۲۰ برس کی عمر تک، وہ وہ سجدے کیے کہ ہر سجدہ گویا ایک جام تھا جو نہاں سے آتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج تک جتنے 'مذہبی' آدمی دیکھے، انھوں نے میرے سکوت کو اپنی گویائی کا حریف پایا۔ آج میں "آزاد مرد" ہوں۔ لیکن جو چیز میرے لہو میں

ہے وہ دوسروں کے صرف لبوں پر ہے۔ علی گڑھ میں رہتے رہتے تینتیس سال ہو گئے ایسا شخص کم دیکھا جس کے دل میں ایمان کی روشنی ہو یعنی اُس کا دل، زبان اور کام ایک ہوں۔ میں اپنی کافر ماجرائی پر نازاں ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ نجات کا غم کیا ہوتا ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ دنیا کیسے برتی جاتی ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ دولت کیوں اور کیسے جمع کی جاتی ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ حلقۂ احباب کیوں کر وسیع کیا جاتا ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ ترقی کی پہلی اور آخری منزل کیا ہوتی ہے۔ زندگی یوں بسر کرتا ہوں کہ موت کو نہیں بھولتا اور انشاء اللہ جب موت آئے گی تو دل پاک اور پرسکون ہوگا۔

۱۹۳۸ء میں دہلی سے ہائی اسکول کیا اور ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ سے ایم اے کیا۔ امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ طالب علمی کے زمانے میں تحریر اور تقریر میں میرا کوئی حریف نہیں تھا۔ بی۔ اے فائنل میں یونیورسٹی یونین ہیرلڈ کرکس کیمبرج اسپیکنگ پرائز ملا، اور طالب علمی کے زمانہ کے ایک مضمون "شبلی" کی داد، ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری اور عبدالماجد دریابادی نے دی۔ ان بزرگوں کے چند جملوں کا مرتے دم تک ممنون رہوں گا۔ مقابلہ کے امتحان میں اس لیے نہیں بیٹھا کہ انگریز سے نفرت تھی۔ وکالت کا خیال اس لیے چھوڑا کہ جھوٹ سے نفرت تھی۔ اردو میں ایم۔ اے اس لیے نہیں کیا کہ رزق یا موت میسر نہیں تھی، بلکہ صرف اس لیے کہ اُس سے عشق تھا۔ مگر علی گڑھ میں اس جرم پر کیا کیا سہنا پڑا یہ دل ہی جانتا ہے۔ علی گڑھ بحیثیت مجموعی "معوج الضمیر" ہے۔ یہاں لوگ ہر قوّال کو امیر خسرو بناتے ہیں۔ اور جو لوگ اعلیٰ قدروں کا نام لیتے ہیں وہ اشتراکی ہوں یا مسلمان، محض بہروپیے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں لکچرر ہوا۔ ۱۹۵۳ء تک علمی زندگی کا ایک بھیانک

روپ دیکھا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں نحیف و نزار رہا ہوں۔ بلکہ یہ سمجھے کہ ہر صاحب جاہ کا رقیب رہا ہوں اور پھر اس کا خمیازہ بھگتا ہے۔ خمیازہ تین صورتوں میں، ایک مسلسل ذہنی تکلیف میں کہ دنیا ایسی کیوں ہے، اور دوسرے روحانی تنہائی میں اور تیسرے ہر جائز حق سے محرومی میں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری وضع مضبوط رہی۔ مگر ایک نقصان اس سے یہ ہوا کہ میں اپنے حوصلہ کے مطابق نہ شعر کہہ سکا اور نہ نثر لکھ سکا۔ یہ ضرور ہے کہ جو کچھ لکھا اُسے اُن بزرگوں اور عزیزوں نے سراہا جو بے لوث تھے اور انھوں نے سکوت اختیار کیا جن کے قلب میں لکنت تھی۔ ۱۹۵۳ء میں لندن یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے گیا اور ۱۹۵۶ء تک رہا۔ یہاں میرے رفیق کار رالف رسل تھے ان سے میری دوستی مثالی ہے۔ ہم نے اردو کا جو کام انگریزی میں کیا ہے اور جو کر رہے ہیں اور کریں گے اس سے امید ہے کہ ہماری زبان دنیا میں معروف ہوگی اور ہمارا ادب دنیا میں شرف قبول پائے گا۔ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم۔

شعر میرا مزاج ہے۔ میں دنیا کے ادب سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اور شعر کی ہر شکل مجھے محبوب ہے۔ اور کوئی موضوع ایسا نہیں جس سے مجھے کسی قسم کا تعصب ہو۔ یورپ میں چار سال اس طرح رہا ہوں جیسے پرندے ہوا میں رہتے ہیں لہٰذا میری نظر میں ہندوستان کا "جدید" بھی کسی حد تک قدیم ہے۔ وہ تعلیم میں ہو، سیاست میں ہو، روزمرہ انسانی تعلقات میں ہو یا ادب میں۔ لیکن مجھے بلا ضرورت اپنے ماحول یا اپنے مزاج سے بغاوت پسند نہیں ہے اور ہرگز ہرگز کسی فیشن یا فارمولے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ غزل میری طبیعت سے ایک خاص مناسبت رکھتی ہے۔ میں نے بہت کہا ہے جس میں سے بیشتر بعض اسباب کی بنا پر ضائع ہوگیا ہے۔ مقدار کی شاعری میں

ایک اہمیت ہے اور اشتہار تو اس زمانہ میں قدرت کے اشارہ کا حکم رکھتا ہے۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ مقدار کم اور اشتہار صفر۔

پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے میری غزل کو سراہا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے میرے مجموعۂ کلام کو ایک فال نیک بتایا۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے گرمجوشی کے ساتھ اس پر عارفانہ تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے رسالہ "صبا" میں اس پر مفصل مضمون لکھا۔ اور علی سردار جعفری نے ایک خط میں لکھا:۔

"برادرم نسیم

اس رات کی مختصر مگر پُرلطف صحبت طویل اور طویل تر صحبتوں سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ زندگی میں اگر اتفاقات اتنے ہی حسین ہوا کریں تو کیا کہنا۔ آپ کی غزل ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے .... ایسا لگتا ہے کہ شعر کی زبان روز بروز گونگی ہوتی جا رہی ہے۔ اس عالم میں ایسی چہکتی اور دہکتی غزل کون کہتا ہے۔ آپ کو اپنی گوشہ نشینی مبارک ہو تاکہ بار بار ایسا دلکش اندازِ سخن جاگے۔"

میں شکوہ کم کرتا ہوں اور محبت زیادہ۔ لہٰذا میں نے جو یہ چند صفحے لکھے ہیں ان میں اگر کہیں غصے کا اظہار کیا ہے یا شکایت کی ہے یا اپنی تعریف کی ہے تو وہ کسی داخلی جبر کی بنا پر کی ہے۔ غصہ اُس پر ہے جسے زمانہ کہتے ہیں اور جو قابو سے باہر ہے۔ شکایت ان سے ہے جن سے محبت تھی اور ہے۔ تعریف اپنی نہیں ہے خدا کی ہے، جو ہر تعریف کے لائق ہے۔

سرراہے

رباب کا سا تموج ستار کی سی لے
کہیں کہیں وہ چھلکتا ہوا پیالۂ مے
کوئی ڈھلی ہوئی دھوپ اور کھنچی ہوئی تلوار
کوئی تلاطمِ دریا کوئی نسیمِ بہار
کوئی حجاب درونِ حجاب و پردہ ساز
کوئی تمام تکلم کوئی فقط اک راز
کوئی وہ لہجہ جو داؤد کی زبور میں ہے
کوئی وہ تلخیٔ احساس جو شعور میں ہے
کوئی وہ فکر جو آواز میں بدل جائے
کوئی وہ خندہ جو برپا نہ ہو پگھل جائے
کوئی وہ موسمِ سرما کی چاندنی کم کم
کوئی وہ رقصِ جواں، ناتمام اور مبہم

کوئی خیال کی جولانیوں میں خوبیِ فرار
کوئی ہزار کنایوں میں ایک ہی اظہار
کوئی وہ موجِ رمیدہ جسے خمار نہیں
کوئی وہ سروِ خمیدہ جسے بہار نہیں
کوئی وہ تیرگی افسردگی میں تازہ نہال
کوئی تغزلِ خسرو میں آہوؤں کا جمال
کوئی وہ برف جو کرنوں کے انتظار میں ہو
کوئی وہ بات جو بجھتے ہوئے شرار میں ہو
کوئی وہ قصہ جو اکثر دراز ہو جائے
کوئی وہ لے جو بڑھے اور ساز ہو جائے
یہ رنگ روپ، یہ سائے، یہ دھوپ چھاؤں، یہ جال
کہیں شریکِ دو عالم، کہیں خیالِ محال

بے دماغی

اپنوں کے تکلف سے مدارات سے ناخوش
غیروں کی توجہ سے عنایات سے ناخوش
حد یہ ہے کہ آپ اپنی ہی اوقات سے ناخوش
یہ بھی ہے کوئی بات کہ ہر بات سے ناخوش
ان باتوں پہ کیا کیا نہ بھلا خوار ہوئے تم
خود اپنے لیے باعث آزار ہوئے تم

بزرگ

جنھیں بزرگ سمجھتے ہیں باپ جانتے ہیں
وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی شان میں اکثر
کوئی قصیدہ پڑھیں یا کوئی غزل گائیں
تمھیں بتاؤ خدا کے لیے کہ اس دکھ کو
کہیں تو کس سے کہیں جائیں تو کہاں جائیں

خلش

دل میں جو غم رہ گیا آواز سے خالی ہوا
دل سے جو آواز نکلی اک نیا غم بن گئی
ہم نے جو عالم کیا پیدا، ادا سے کم رہا
اس ادا کا نام کیا ہوگا جو عالم بن گئی

نوجوان

دل داغ ہے اس غم سے کہ دلبر نہیں ملتا
گردن بھی جھکاتے ہیں تو خنجر نہیں ملتا
خوابوں سے الجھتے ہیں حقیقت نہیں ملتی
طوفان سے لڑتے ہیں سمندر نہیں ملتا

تجربہ

اک دل کی شرافت پہ ہمیں ناز تھا لیکن
اس عیب پہ یاروں نے بہت ہم کو رلایا
اک عقلِ سبک سیر تھی کچھ وجہِ تسلی
اس جرم پہ غیروں نے بہت ہم کو ستایا
گھبرا کے گئے خم کدۂ اہلِ صفا میں
کیا کہیے کہ کیا ان کی سیاست نے ڈرایا
غیروں میں یہاں غیر کوئی ہم نے نہ دیکھا
یاروں میں یہاں یار کوئی ہم نے نہ پایا

اجنبی سے

تیری وادی کے صنوبر، میرے صحرا کے ببول
اُن پہ اک لرزہ سا طاری، ان کے مرجھائے سے پھول
تیرا جی ان سے خفا اور میرا دل ان پر ملول
کیا یہ ممکن ہے کہ ان کا فاصلہ ہو جائے کم
خاک کے سینے پہ آخر کب تلک یہ بارِ غم

آدمی

ہر گل کا اپنا رنگ ہے، ہر گل کی اپنی بو
ہر گل کا اپنا نام ہے، ہر گل کی اپنی خو
باغوں کے پھول پیارے ہیں لیکن وہ اجنبی
کھلتے ہیں جو خرابے میں پیارے تو وہ بھی ہیں
ویرانیوں کے راج دلارے تو وہ بھی ہیں
میرے دل و نظر کے سہارے تو وہ بھی ہیں

آرزو

ہجومِ گل ہے کہ دل اور نظر کا خوابِ جمیل
ہجومِ گل ہے کہ رقصاں ہیں مہر و ماہ و نجوم
ہجومِ گل ہے کہ آتش، ہجومِ گل ہے کہ رنگ
یہ سیلِ مے ہے کہ ہے اپنی موج موج سے دنگ
ہجومِ گل ہے کہ خوشبو کا ساز بجتا ہے
ہجومِ گل ہے کہ یہ میرا دل دھڑکتا ہے
خدا کرے کہ یہ ساعت، یہ مے، یہ رنگ، یہ ساز
یہ جوشِ بادۂ گیتی، یہ میرا خوابِ جمیل
نیا دماغ، نیا دل، نئی ادا بن جائیں
یہ سب یہ سب رہیں، پر اس سے کچھ سوا بن جائیں

انقلاب

وہ کاروانِ گلِ تازہ، جس کے مژدہ سے
دماغ عشق معطر ہے اور فضا معمور
دلوں سے کتنا قریب ہے، نظر سے کتنا دُور

خیر اور شر

ایک بھرا ناگ
کاجل ناگ
بجلی کی طرح
دفعتاً لپکا کہیں سے تاج کی محراب پر
اور ڈس کر چل دیا
بے خطر، آسودہ، خوش دل، شادکام

فرنگ

کیسی توانا، کیسی چنچل، کتنی شوخ اور کیا بیباک
کیسی امنگیں، کیسی ترنگیں، کتنی صاف اور کیسی پاک
ہوش کی باتیں، شوق کی گھاتیں، جوشِ جوانی سینہ چاک
خندہ ایسا جیسے رقص
باتیں ایسی جیسے ساز
کیسی توجہ، کیسی محبت، جس میں شامل کم کم ناز

یہ رات

کہیں تو نَس ہے کہیں رات ناگ رہی ہے
کہیں تو ٹیسے کہیں سانس تار تار سی ہے
غضب کی سرد، قیامت کی تنگ تیرہ نصاب
عجیب رات ہے کرنا پڑا ہے جس کا حساب
دل و نگاہ کے ٹوٹے ہوئے پیالوں میں
لب و دماغ کے الجھے ہوئے سوالوں میں

ان آنسوؤں میں جو طوفان کی طرح اٹھے
مگر بہ پاسِ حیا تھم گئے ہیں آنکھوں میں
جگر کے ٹکڑوں میں جو آنسوؤں کے ساتھ چلے
نڈھال ہو کے مگر جم گئے ہیں آنکھوں میں

عجیب رات ہے کرنا پڑا ہے جس کا حساب

کسی غریب کی ان مکنتوں میں جن کی مراد
بسانِ قطرۂ خوں نوکِ خار پر لرزے
کسی شریف کی ان عصمتوں میں جن کا ضمیر
کسی امیر کے ہر اختیار پر لرزے

عجیب رات ہے کرنا پڑا ہے جس کا حساب

کسی جوان کے سینے کی ان خراشوں میں
جو چلتی، رکتی، اٹکتی ہوں سانس کی مانند
کسی بزرگ کی ان حسرتوں میں جو چپ ہوں
بہ لحظہ لحظہ کھٹکتی ہوں پھانس کی مانند

عجیب رات ہے کرنا پڑا ہے جس کا حساب

کبھی گناہ کے بڑھتے ہوئے اجالوں میں
کبھی ثواب پہ جھپتے ہوئے خیالوں میں
کبھی سزاؤں میں جو ہم کو بار بار ملیں
کبھی عطاؤں میں جو صورتِ خمار ملیں
شرافتوں میں کسی کی جو اک لبادہ تھیں
مروتوں میں کسی کی جو کچھ زیادہ تھیں

عجیب رات ہے کرنا پڑا ہے جس کا حساب

گرانیوں میں وہ بازار کی ہوں یا سر کی
تباہیوں میں وہ تاریخ کی ہوں یا گھر کی
ہزار دعووں میں جو سایہ دار تھے گویا
ہزار وعدوں میں جو بادہ بار تھے گویا
ہزیمتوں میں جو سو بار سب نے دیکھی ہیں
ہزار حیلوں میں جو ہر بار سب نے دیکھی ہیں

عجیب رات ہے کرنا پڑا ہے جس کا حساب

ہمیں، خزاں کو جو یہ باد و نثار بیٹھے ہیں
دھرے ہوئے جو اندھیروں پہ وہ دار بیٹھے ہیں
یہ کس کی جیت ہے اور کس کی مات ہے بولو
بھری دوپہر میں کیوں آدھی رات ہے بولو

پیاس

دور سے چل کے آیا تھا میں ننگے پاؤں ننگے سر
سر میں گرد، زباں پہ کانٹے، پاؤں میں چھالے، ہوش تھے گم
اتنا پیاسا تھا میں اس دن، جتنا چاہ کا مارا ہو
چاہ کا مارا، وہ بھی ایسا، جس نے چاہ نہ دیکھی ہو
اتنے میں کیا دیکھا میں نے ایک کنواں ہے ستھرا سا
جس کی من ہے پکی اونچی جس پہ چھاؤں ہے پیڑوں کی
چڑھ کر من پہ جھانکا میں نے جوشِ طلب کی مستی میں
کتنا گہرا، اتنا گہرا، جتنی ہجر کی پہلی رات
کیسا اندھا، ایسا اندھا، جیسی قبر کی پہلی رات
کنکر لے کے پھینکا تہ میں
پانی کی آواز نہ آئی
اس کا دل بھی خالی تھا

جو دو ہزار برس اور بھی جیے ہوتے

جو دو ہزار برس اور بھی جیے ہوتے
تو کیا خدا کی خدائی میں فرق آ جاتا
ہمارے ہونے سے کس چیز میں خلل پڑتا
خدا کی شان میں بندوں کے آب دانے میں
فلک کے نظم، عناصر کے تانے بانے میں
ہوا کی سمتوں کہ پانی کے کارخانے میں
زمیں کی گرمی کہ یاقوت کے خزانے میں
ہمارے ہونے سے کس چیز میں خلل پڑتا

ہوس نہیں ہمیں جینے کی بے سبب بے سود
نہ ہم نجات کے طالب نہ ہم کو شوقِ نمود
نہ یہ خیال کہ ہو جائیں عبد سے معبود

ہمارے دل میں بھڑکتا ہے ایک شعلہ سا
وہ شعلہ خواب بھی ہے آرزو بھی حسرت بھی
وہ شعلہ ڈستا بھی ہے اور دعا بھی دیتا ہے

وہ شعلہ کہتا ہے جیتے رہو، جیو، جی لو
کہ موت آئے گی، آنی ہے، ٹل نہیں سکتی
مگر جو جیتے رہے تم تو ایک دن ایسا
ضرور آئے گا، آ کر رہے گا، دیکھو گے
کہ فاصلے نہ زمیں کے نہ آسماں کے رہے
کہ مرحلے من و تو کے نہ این و آں کے رہے
کہ فرق حرف و صدا کے نہ کچھ بیاں کے رہے
کہ حسن کعبہ میں ہے اور نہ سومنات میں ہے
جو حسن ہے وہ فقط آدمی کی ذات میں ہے

کبھی گلوں کبھی خاروں کے درمیاں گزری
صبا چمن سے بظاہر تو شادماں گزری

اسی کا نام ازل ہے، اسی کا نام ابد
وہ ایک رات جو پھولوں کے درمیاں گزری

کہیں لپک اٹھے شعلے، کہیں مہک اٹھے گل
شبِ فراق نہ پوچھو کہاں کہاں گزری

بشکلِ قامتِ آدم، بہ طرزِ رقصِ پری
ہمارے سر پہ قیامت بھی کیا جواں گزری

کبھی کبھی تو غمِ دل کی لے بڑھی اتنی
دلِ حیات کی دھڑکن بھی کچھ گراں گزری

نہ جانے کتنے نشیب و فراز راہ میں تھے
مگر یہ عمرِ دو روزہ رواں دواں گزری

بہم رہے ہیں سر و سینہ یک دگر کیا کیا
کہ سر پہ تیغ پڑی دل سے جب سناں گزری

بہتر ہے یہی اہلِ جہاں، مجھ کو نہ چھیڑو
ہے برق مرے دل میں تپاں مجھ کو نہ چھیڑو

مانا کہ تمھیں پیرِ زمانہ سے ہے بیعت
حاصل ہے تمھیں قربِ شہاں، مجھ کو نہ چھیڑو

ناداں تو نہیں ایسے کہ تم مجھ کو نہ جانو
مشہور ہوں میں شوخ زباں، مجھ کو نہ چھیڑو

اتنا تو ذرا سوچو کہ جس شہر کے تم ہو
اس شہر کا میں بھی ہوں، میاں مجھ کو نہ چھیڑو

جس باغ سے تھا دعوئِ نسبت کبھی تم کو
اس باغ کا ہوں سروِ جواں، مجھ کو نہ چھیڑو

کہتے ہیں کہ وسعت سے بہت کون مکاں کی
تم کو ہے غمِ کون و مکاں، مجھ کو نہ چھیڑو

بازار میں بکتی ہیں رسولوں کی قبائیں
ہے غم یہ مرے دل پہ گراں، مجھ کو نہ چھیڑو

انسان کو انسان کی توقیر [illegible]
تم اور سجاؤ یہ دکاں مجھ کو نہ چھیڑو

تم سیرِ فن طرہ [illegible]
میں حیرتیِ زلفِ بتاں، مجھ کو نہ چھیڑو

تم مصلحت [illegible]
میں جرأت [illegible]

نا [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

اک عمر سے ہیں اور مرے جیبِ گریباں
ہیں دست و گریباں غمناں مجھ کو نہ چھیڑو

ناکام امنگوں کی ادھر آ گئی ہے
اے خوش نگہاں سنگ دلاں مجھ کو نہ چھیڑو

○

باغِ جہاں کے سادہ جمالوں سے عشق ہے
سبزہ سے، گُل سے، سرو سے، لالوں سے عشق ہے

آنکھوں کے بادہ بار پیالوں سے عشق ہے
سینے کے بے دریغ سوالوں سے عشق ہے

سادہ سی گفتگو کے خم و پیچ ہیں عزیز
خاموشیوں کے گرم مقالوں سے عشق ہے

ہاں خار و خس سے دل کو علاقہ ہے پاس کا
ہاں اس چمن کے تازہ نہالوں سے عشق ہے

جو باہنر ہیں ان کے قدم چومتے ہیں ہم
جو بے ہنر ہیں ان کے کمالوں سے عشق ہے

بوڑھوں کے پارہ پارہ عزائم کا ہے ملال
بچوں کے تازہ تازہ سوالوں سے عشق ہے

ہر بے نوا فقیر کو دیتے ہیں خونِ دل
ہر خوش نوا فقیر کے نالوں سے عشق ہے

سارے جہاں کے تلخ نواؤں سے بے نیاز
سارے جہاں کے شیریں مقالوں سے عشق ہے

یاں کفر و دیں کے جاننے والوں سے کیا غرض
یاں کفر و دیں کے ماننے والوں سے عشق ہے

جتنے نغمے تھے وجہِ خلش بن گئے، جتنے نالے تھے حسرت ہوا ہو گئے
ہم وہی ہیں جو کل تھے مگر کیا ہوا، ہم وہی ہیں مگر کیا سے کیا ہو گئے

جن کے ذہن تہی اور خالی تھے دل، جن کی جرأت تھی کم اور جاں مضمحل
آستانوں پہ سجدے وہ کرتے رہے، رفتہ رفتہ ہمارے خدا ہو گئے

اس زمانے کے جو میر و سلطان تھے، نوعِ آدم میں یعنی جو انسان تھے
دل سے پائی انھوں نے وہ نشو و نما، تیرے کوچے کے آخر گدا ہو گئے

شور سینوں میں اٹھ اٹھ کے دبتے رہے، دل جگر دورِ گردوں میں کھپتے رہے
ہاتھ کتنے تھے یاں جو قلم ہو گئے، ساز کیا کیا تھے جو بے صدا ہو گئے

بار دنیا کے سانچے میں ڈھلتے رہے، شمعِ فانوس تھے ہم پگھلتے رہے
اپنی تنہا روی، اپنا سوزِ دروں، ہم بھی دنیا میں اک ماجرا ہو گئے

اب نہ خطرہ ہے دل میں نہ کوئی خلش، ایک باقی رہا ہے تو ننگ تپش
دل سبک اور سادہ ہے اس طور سے، قرض جتنے تھے گویا ادا ہو گئے

غم سنورتے رہے ہم سنبھلتے رہے، شوقِ منزل کے شیوے بدلتے رہے
تھے جو نزدیک ہم سے وہ اب دور ہیں، تھے جو نا آشنا آشنا ہو گئے

○

کس سے کہیں کہ بے سبب صرف ہے خوں کا دم بدم
دل کی فسردگی کا رنج، شوق کی آبرو کا غم

کچھ تو ہو جس کے فیض سے، دل کو ہو تاب و تب بہم
کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم

درد رواں ہے موج موج، موجِ نفس کے ساتھ ساتھ
موجِ نفس ہے جاں فزا، لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم

رنگ برنگ ہے نظر، ذوق بہ ذوق ہے اثر
دست بہ دست ہے رواں، اوج بہ اوج، جامِ جم

ساز یہی، سبب یہی، طور یہی طرب یہی
سینہ میں آگ، سر میں شور، چہرہ پہ آب، آنکھ نم

کیسے کہوں کہ بے خودی میرے لیے نشاط ہے
کیسے کہوں کہ ہیچ ہے میرے لیے شکوہِ جم

ربط کیسا تھا دل و دیدۂ و جاں میں پہلے
تھا کوئی اور جہاں اپنے جہاں میں پہلے

دل دھڑکتا ہے تو رونے کی صدا آتی ہے
ایک ہنگامہ سا رہتا تھا مکاں میں پہلے

خاک سی اُڑتی ہے سینے میں یقیں کے ہر دم
قافلے آ کے ٹھہرتے تھے گماں میں پہلے

یک بیک دل سے چھلک پڑتی تھی اک موجِ طرب
لذتِ جاں تھی عجب شورشِ جاں میں پہلے

اب تردّد ہے، تامل ہے، تاسف ہے تمام
تاب تھی غم میں، تمنّا تھی فغاں میں پہلے

اب جو ہے گرمیٔ بازار تو ہم اس میں نہیں
ہم بھی تھے گرمیٔ بازارِ جہاں میں پہلے

لہلہاتا ہے جو قامت میں قیامت کا چمن
یہ سجاوٹ تو نہ تھی سروِ رواں میں پہلے

صف بہ صف بندشِ اعضا کا برہنہ پیچ و خم
ایسی یورش بھی نہ دیکھی تھی جہاں میں پہلے

یہ کشش کب تھی بھلا کافِ کرم میں کہ جو ہے
یہ تپش کب تھی بھلا، روئے بتاں میں پہلے

دخترِ پیرِ مغاں کی یہ نوازش ہے کہ اب
گھر پہ ملتی ہے جو ملتی تھی دوکاں میں پہلے

کسی محفل میں ہیں سر کی گرانباری کے ہنگامے
کسی محفل میں ہیں دل کی عزاداری کے ہنگامے

جو ہوں تنہا تو اندیشوں کی بیداری کے ہنگامے
ہمیں تو مار رکھیں گے یہ بے کاری کے ہنگامے

کہاں جائیں کہ میں جسمِ سیلِ جان بن جائے
نہ رغبت ہو نہ کاوش ہو نہ بیزاری کے ہنگامے

گل و گل ہوں جدھر دیکھیں نظر ہو اور نظارہ
نہ آشوبِ فراغت ہو نہ ناداری کے ہنگامے

مبارک ہو تمھیں آنکھوں کی بیداری کہ دنیا ہو
ہمیں تو بس ہیں جان و دل کی بیداری کے ہنگامے

یہ دولت دولتِ باقی ہے جس کے ہاتھ آجائے
دروں بینی کی آسائش نگہ داری کے ہنگامے

یہاں ہر موج ایک پیکرِ ہے پیکرِ جانِ نغمہ ہے
نظر میں لحظہ لحظہ ہیں نمو داری کے ہنگامے

زمیں کی گردشیں تک محو ہیں وہ رقص پیہم ہے
دلِ وحشی ہے اور وحشت کی سرشاری کے ہنگامے

گیا دورِ جوانی پھر بھی اکثر یاد آتے ہیں
ہوس کی تیز جولانی طرح داری کے ہنگامے

بدن کی تاب، تائیدِ ہوس، پندار یکتائی
وہ گرم و تازہ و شاداں سیہ کاری کے ہنگامے

حریفوں کو مری ثروت پہ کیا کیا رشک آتا ہے
کہ ہر شب جامِ مے ہے اور جہاں داری کے ہنگامے

میری نظر میں دوستو جس شہر کے گلزار ہیں
سبزہ بڑا سرکش ہے واں اور سرو خوش رفتار ہیں

شاخیں ہیں واں آراستہ اور گل ہیں واں نوخاستہ
پیالے ہیں جن کے مدھ بھرے اور پیرہن زرتار ہیں

ہر ہر قدم پر خوبرو، آرام جاں اور کام جو
آنکھوں میں غنچوں کی چٹک چہرے غضب گلنار ہیں

جتنے یہ کم آمیز ہیں اتنے ہی شوق انگیز ہیں
ظاہر میں جتنے سخت ہیں اتنے ہی کم آزار ہیں

مہر و وفا میں کم نہیں لیکن ہوس سے رم نہیں
پروائے مدح و ذم نہیں ثابت ہیں اور سیار ہیں

آنکھیں ہیں جرعہ جرعہ مے سینہ ہے موجیں پے بہ پے
قامت ہے نغمہ نغمہ لے سادہ ہیں اور پرکار ہیں

ان کی نگہ کا صاعقہ کرتا ہے کارِ الُفتہ
چکھیں جو اس کا ذائقہ ساتوں سمندر پار ہیں

حرفِ غلط دینِ کہن، سارے حجاباتِ بدن
آزاد ہیں سب مرد و زن سب آدمی سب یار ہیں

جاگے ہوئے ہیں میکدے سے ہر کفر و ایماں سے پرے
بکھری ہوئی تسبیح ہے ٹوٹے ہوئے زنّار ہیں

○

یہ مانا نت نئے فتنے، عجب، رنج و محن جاگے
مگر یہ بھی تو دیکھو۔ حیا سو گیا کیا چمن جاگے

بجھے بیٹھے رہیں کب تک، بس اب شیشے کو چھلکاؤ
لہو چھلکے، نفس جھلکے، خرد ناچے، بدن جاگے

خمارِ بے دلی حد سے فزوں ہے اور دل تنہا
کوئی ایسی غزل چھیڑو کہ ہر داغِ کہن جاگے

کہو گیسوئے مشکیں سے کہ بادل جھوم کر اٹھیں
ذرا بندِ قبا کھولو کہ گل کی انجمن جاگے

کوئی ایسی بھی ساعت ہو، کوئی ایسی بھی شب آئے
کہ میری حسرتیں سو جائیں، تیرا بانکپن جاگے

چلے ساغر، ہلیں دامن، ملے سینہ، جھکیں نظریں
ستارے جگمگا اٹھیں، زمیں سوئے، گگن جاگے

خمارِ آرزو اس رنگ اس انداز سے ٹوٹے
کہ تم شانے پہ سر رکھو تو بستر کی شکن جاگے

کتابِ جسم نرمی سے، ورق اندر ورق دیکھیں
حجابِ شوق گرمی سے شکن اندر شکن جاگے

بدن تھک جائیں، شل ہو جائیں، آنکھیں بند ہو جائیں
گلے سے لگ کے یوں سوئیں، چمن اندر چمن جاگے

عجب عالم دکھایا ہے تری کافر ادائی نے
جوانانِ خطا ابھرے، غزالانِ ختن جاگے

یہی شانِ کریمی ہے، یہی کارِ چمن بندی
کہ جب غنچہ کا دل شق ہو تو گل کا پیرہن جاگے

ہو وہ شے جو ہم پیتے ہیں جم پیتا تھا، زمزم کیا
جسے پینے سے اے واعظ نہ تن جاگے نہ من جاگے

اختر انصاری

میں ۱۹۰۹ء اپنے آبائی وطن بدایوں میں پیدا ہوا۔ اس سے کچھ پہلے میرے والد بدایوں کی سکونت ترک کر چکے تھے۔ چنانچہ میں نے دہلی میں ہوش سنبھالا، اور دہلی میں تعلیم و تربیت کے منازل طے کیے۔ قدیم اینگلو عربک ہائی اسکول، دہلی کا طالب علم رہا۔ ۱۹۲۴ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی میں داخل ہوا۔ اور ۱۹۳۰ء میں ہسٹری میں بی۔اے (آنرس) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں انگلستان گیا، لیکن والد کے انتقال اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر کچھ کیے بغیر اسی سال لندن سے دہلی واپس آنا پڑا۔ ۱۹۳۲ء میں قانون پڑھنا شروع کیا جس کو ایک سال سے زیادہ جاری نہیں رکھ سکا۔ ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ میں بی۔ٹی کے لیے داخلہ لیا اور ۱۹۳۴ء میں مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں ملازمت کا آغاز کیا ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ سے اردو میں ایم۔اے کیا اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر کی حیثیت سے آیا۔ یہاں سے ۱۹۵۰ء میں منتقل ہو کر شعبۂ تعلیم میں لیکچرر ہوا، جہاں اب تک کام کر رہا ہوں۔

۱۹۲۸ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ چند سال کے بعد افسانہ، تنقید اور دوسری اصناف نثر کی طرف بھی توجہ کی۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے دو مجموعے قطعات کے (آبگینے اور ٹیڑھی زمین)، دو مجموعے غزلیات کے (خوناب اور سرودِ جاں)، تین مجموعے نظموں کے (خندۂ سحر، روحِ عصر اور چند نظمیں) ایک مجموعہ رباعیات کا (شعلۂ بجام)، اور ایک مثنوی (درد و داغ) شائع ہو چکی ہے۔ کلام کا سب سے پہلا مجموعہ نغمۂ روح تھا جو ۱۹۳۲ء میں شائع

ہوا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کے کلام کا ایک جامع اور نمائندہ انتخاب (دہانِ زخم) جو چالیس سال کی شعری تخلیقات کا خلاصہ ہو گا آج کل زیرِ ترتیب ہے۔

افسانوں کے تین مجموعے (اندھی دنیا، ناآزودہ اور خونی) شائع ہوئے۔ چوتھا مجموعہ (بہروپیا اور دوسرے افسانے) طباعت کا منتظر ہے۔

تنقید کے باب میں تین مستقل تصانیف (افادی ادب، ایک ادبی ڈائری اور حالی اور نیا تنقیدی شعور) کے علاوہ تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ (مطالعہ و تنقید) شائع ہو چکا ہے۔ اور دوسرا زیرِ ترتیب ہے۔

تعلیم سے متعلق غزل اور درسِ غزل کے علاوہ دو کتابیں انگریزی میں چھپ چکی ہیں۔ انگریزی ہی میں غالب پر ایک مختصر کتاب زیرِ طباعت ہے۔

اختر انصاری (دہلوی)

۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء

رُباعیات

ترکش میں بہت تیر لیے پھرتا ہے
ہر خواب کی تعبیر لیے پھرتا ہے
دراصل بھکاری ہے سپہرِ دوّار
جو کاسۂ تقدیر لیے پھرتا ہے

تقدیرِ ازل آہ تو بھرتی ہوگی
روحِ ابدی درد سے مرتی ہوگی
سچ یہ ہے کہ ہم اہلِ جہاں کیا جانیں
جو خالقِ عالم پہ گزرتی ہوگی

ارضیّت اپنے بند کستی ہی رہی
میلانِ ورائیت کو ڈستی ہی رہی
انسان رہا اپنی پرستش میں مگن
صہبائے ہر بجم برستی ہی رہی

کیا قہر کو معبود پیے بیٹھا ہے!
انصاف کے ہونٹوں کو سیے بیٹھا ہے
آدم نے بنا ڈالے جہنم لاکھوں
تو ایک جہنم کو لیے بیٹھا ہے!

اک بحث میں کہنے لگے اک صوفیِ غور
ہے عمر مری اسّی برس کی بھرپور
اس پہ یہ کہا میں نے کہ پھر بھی مجھ سے
دو ڈھائی ہزار سال چھوٹے ہیں حضور

یہ آج کی دنیا بھی ہے مرنے والی
اک زندگیِ نَو ہے اُبھرنے والی
ہم پچھلی صدی میں ہیں ابھی، اور یہاں
موجودہ صدی بھی ہے گزرنے والی

وہ بادۂ عشرت میں ڈبوئے ہوئے دن
وہ پیار کی لڑیوں میں پروئے ہوئے دن
رودادِ جوانی کے مہکتے اوراق
وہ جاگی ہوئی راتیں، وہ سوئے ہوئے دن

آتے ہیں خیالوں سے شرارے چھن کر
آہوں سے مری زمزمہ پارے چھن کر
تخئیل سے اس طرح برستے ہیں شعر
چھلنی سے گریں جیسے ستارے چھن کر

ناظر کی نگاہوں سے لجانے والے!
بازی گہِ عالم کے سجانے والے!
صورت تو دکھا، سامنے آ، داد تو لے
تقدیر کی شہنائی بجانے والے!

سوتے سے تجھے جھنجھوڑ دے گا پیارے
نازک گردن مروڑ دے گا پیارے
یہ چرخ کہ ہے پشت خمیدہ جس کی
کل تیری کمر بھی توڑ دے گا پیارے

اس زیست کی راہوں میں ہیں دونوں یکساں
تقدیر کی باہوں میں ہیں دونوں یکساں
واعظ! ترا علم اور مرا جہل تمام
گردوں کی نگاہوں میں ہیں دونوں یکساں

جو تخمِ سعادت تھے وہ بوئے کس نے؟
جو داغ تھے حرماں کے وہ دھوئے کس نے؟
معبود! مری دلقِ گدا یانہ میں
سونے کے جو ہیں تار پروئے کس نے؟

قطعات

یہ بوسیدہ پھٹی گدڑی، یہ سوراخوں بھری کملی
جسے سب آسماں کے نام سے موسوم کرتے ہیں
تری رحمت کے قرباں، اس کو نیچے پھینک دے یارب
زمیں والے بہت راتوں کی سردی میں ٹھٹھرتے ہیں

راندۂ مسلکِ آئین مبیں ہیں ہم بھی
ناکس و دل زدہ و خاک نشیں ہیں ہم بھی
تیری نا اہل نوازی کے تصدق اے چرخ!
کچھ بہت اہل و خردمند نہیں ہیں ہم بھی

خیال نبضِ جنوں کی طرح پھڑکتا ہے
شعور سوزِ دروں کی طرح بھڑکتا ہے
میں زندگی کو بھی اک فن خیال کرتا ہوں
مرا دماغ بھی دل کی طرح دھڑکتا ہے

دردِ آگیں ناکسی کی بات ہی کچھ اور ہے
پُر الم بے مائگی کی بات ہی کچھ اور ہے
ایک بے پایاں خلا ہے تو بھی گو اے آسماں!
میرے دامانِ تہی کی بات ہی کچھ اور ہے

اک شورِ بے اماں کہ ترانہ کہیں جسے
اک تشنگی کہ پینا پلانا کہیں جسے
کیا کہیے کس فریب کے مارے ہوئے ہیں ہم
اک ابتری کہ نظمِ زمانہ کہیں جسے

تمام عمر رہے جو رہینِ حسرتِ مے
نہ چکھی اور اسی حسرت میں مر گئے پیاسے!
زمیں مطالبہ کرتی ہے اُن کے حصے کا
ہمارے جام سے اکثر چھلک ہی جاتی ہے

یہ تری تخلیقِ نافرجام، یہ ٹیڑھی زمیں
حشر تک ٹیڑھی رہے گی، اس میں تو معذور ہے
آ کہ سینے سے لگا لیں خالقِ برحق! تجھے
جتنے ہم مجبور ہیں اُتنا ہی تو مجبور ہے!

نسیمِ باغ کی فرحت کہاں سے لائے تم؟
شگفتہ پھول کی نزہت کہاں سے لائے تم؟
تمہاری زیست تو آخر اُجاڑ صحرا ہے
یہ لالہ زار طبیعت کہاں سے لائے تم؟

سازِ غم کے تار ہلتے ہی رہے
روز تازہ زخم ملتے ہی رہے
لہلہاتا ہی رہا اپنا چمن
زندگی بھر پھول کھلتے ہی رہے

زخم کھانے کے دن گئے، لیکن
یاد کے زخم تو مہکتے ہیں
آنکھیں اب بھی برستی ہیں اختر
دل کے داغ آج بھی دہکتے ہیں

زمین و اہلِ زمیں کے بنانے والے سن
ترا یہ ڈھنگ ہے کتنا عجیب اور نیارا
کہ دستِ خاص سے اپنے اچھوتی اک مورت
بنائی اور بنا کے زمیں پہ دے مارا

مسجدِ ویراں

گھِسی پھٹی یہ چٹائی کھجور کی، یعنی
رہینِ سجدہ کو سجادہ لاجواب مِلا
کہاں کے گنبد و مینار، چھت بھی غائب ہے
خوشا کہ سایۂ پُر نورِ آفتاب مِلا
وضو کے بدھنے کہاں ہیں؟ کسی نے گر پوچھا
یہاں وضو کی ضرورت نہیں، جواب مِلا
اس احتیاج کی ماری ہوئی عبادت میں
عذاب پہنچا کسی کو نہ کچھ ثواب مِلا
غرض کہ خیر سے ہم خانماں خرابوں کو
خدا بھی اپنی طرح خانماں خراب مِلا

خرابیوں کی یہ ہے انتہا، خدا رکھّے!
شریکِ طالعِ بد ہے خدا، خدا رکھّے!

فسادات

(۱۹۴۷ء)

تیغِ ستم سے جب بھی کسی کا لہو بہا
فوراً ادا کیا دلِ پُرخوں نے خوں بہا
توہینِ ذوق، مرگِ تمنا، ضیاعِ حُسن
تھا کون سا عذاب جو دل نے نہیں سہا؟
تتلی کے پر گرے تو قیامت گزر گئی
ٹوٹا جو پھول شاخ سے "ہے ہے غضب" کہا
لیکن دل و زباں ہیں عجب طرح گنگ آج
اب یوں بھی کہنے سننے کو باقی ہی کیا رہا؟

اب کچھ کہے تو مبدءِ آفات ہی کہے!
ربِّ جہول و خالقِ ظلمات ہی کہے!

اے دلِ بے کاسہ مست!

اے دلِ بے کاسہ مست! اُف رے دلِ بے کاسہ مست!
تیرے اس نشے کے آگے نشۂ عرفاں بھی پست
تیری مستی میں نہاں ہر رنگِ مستی کی شکست
اے دلِ بے کاسہ مست!

ساری دنیا سے انوکھی طرزِ مے نوشی تری
اُف یہ خود مستی، یہ سرشاری، یہ مدہوشی تری
جس کے آگے بے حقیقت کیفِ صہبائے الست
اے دلِ بے کاسہ مست!

شوقِ بے پایاں کی پیہم سعی و کاوش، الاماں!
داغ ہائے عشق کی رنگیں تراوش، الاماں!
غرق اِس شوریدگی میں خلفشارِ بود و ہست
اے دلِ بے کاسہ مست!

لَو اگر دینے لگا سینے میں تازہ کوئی داغ
جل اُٹھے یا دفعتاً دیرینہ زخموں کے چراغ
ہو گیا گویا تری سرمستیوں کا بندوبست
اے دلِ بے کاسہ مست!

تلملا اُٹھے کبھی جو نشتریں یادوں کے گھاؤ!
یا بھڑک اٹھا سُلگتی آرزوؤں کا الاؤ!
عرش تک تیری ترنگوں نے لگائی ایک جست!
اے دلِ بے کاسہ مست!

حکمراں تیرے مقدر پر خزاں سامانیاں
تیری تدبیروں کے دامن میں فقط ویرانیاں
اور تو نغمہ بہ لب، غنچہ بہ کف، مینا بدست
اے دلِ بے کاسہ مست!

تجھ کو رہتی ہے تباہی میں بھی عشرت کی تلاش
جرعہ ہائے سمِّ قاتل میں حلاوت کی تلاش
اے مرے لذّت پرست! اُف رے مرے لذّت پرست!
اے دلِ بے کاسہ مست!

○

لطف لے لے کے پیے ہیں قدحِ غم کیا کیا!
ہم نے فردوس بنائے ہیں جہنم کیا کیا!
حلقۂ دامِ وفا، عقدۂ غم، موجِ نشاط
یہ زمانہ بھی دکھاتا ہے چم و خم کیا کیا!
لذتِ ہجر کبھی، عشرتِ دیدار کبھی
آرزو نے بھی طبیعت کو دیے دم کیا کیا!
شامِ ویراں کی اداسی، شبِ تیرہ کا سکوت
دلِ محزوں کو ملے ہمدم و محرم کیا کیا!
ہائے وہ عالمِ بے نام کہ جس عالم میں
بیت جاتے ہیں دلِ زار پہ عالم کیا کیا!
دب گئے منتِ مزدور سے ایواں کتنے
جھک گئے غیرتِ مفتوح سے پرچم کیا کیا!
تھے مسلح غمِ معشوق سے گو ہم اخترؔ
پھر بھی دکھلائے غمِ دہر نے دم خم کیا کیا!

یہ صنمِ روایت ونقل کے ہبل و منات سے کم نہیں
تیرا فکرِ واعظِ حق نوا! کسی سومنات سے کم نہیں

کہیں برق چمکے مَیں جل اُٹھوں، کوئی تارہ ٹوٹے مَیں رو پڑوں
یہ دلِ ستم زدہ ہم نشیں! دل کائنات سے کم نہیں!

کہیں رنگ و نورِ جمال ہے، کہیں بیم و فکرِ مآل ہے
کہیں شام غیرتِ صبح ہے، کہیں دن بھی رات سے کم نہیں

جسے کہیے رقصِ شرارِ غم وہ اگر ہو شاملِ غم تو پھر
غمِ دل ہو یا غمِ زندگی، غمِ کائنات سے کم نہیں!

یہ سرودِ اخترِ دل زدہ رجزِ بہار و شباب ہے
یہ بلند ہوتی ہوئی فغاں علمِ حیات سے کم نہیں

○

وہ ادا بھی قہر کی تھی ادا مزہ درد کا جو چکھا گئی
الم و نشاطِ فراق کا مرے منہ کو خون لگا گئی

تب و تابِ جاں مری رات کو شبِ نالہ و شیون بنا گئی
کبھی جامِ اشک چھلک اُٹھا، کبھی آہ نغمے لُٹا گئی

رخِ سیم رنگ کی چاندنی کبھی اک جھلک جو دکھا گئی
مرے دل کا درد ٹھہر گیا، میرے غم کو نیند سی آگئی

کبھی بے کلی نے کرم کیا کہ تھپک تھپک کے سُلا دیا
کبھی بے خودی بڑھی اس قدر کہ شبوں کی نیند اُڑا گئی

وہ نہ جانے کس کی تھی آرزو، وہ نہ جانے کیسی تھی آرزو
جو مجھے بھی خون رُلا گئی، جو لہو میں خود بھی نہا گئی

وہ مرا جنونِ شگفتہ رُو، وہ کسی کے نازِ شگفتہ خو
یہ شگفتگی بھی عجیب تھی کہ ہنسا ہنسا کے رُلا گئی

وہ ہزار دشمنِ دل سہی، وہ ہزار دشمنِ جاں سہی
میں نصیبِ عشق کو کیا کروں، یہی دشمنی مجھے بھا گئی

غمِ آرزو ہی کی دین تھی، وہ رجائیت وہ نشاطیت
مری حسرتوں پہ جو چھا گئی، مرے درد میں جو سما گئی

میں شہیدِ جورِ فلک نہیں، میں قتیلِ دورِ زماں نہیں
میں خود اپنی آگ میں جل بجھا، نظر اپنی ہی مجھے کھا گئی

میں بتاؤں کیا ہے یہ شاعری، یہ نوائے دل، یہ سرودِ جاں
کبھی درد لفظوں میں ڈھل گیا، کبھی میں لے میں سما گئی

نہ تلاشِ مرہمِ زخمِ دل، نہ دوائے درد کی جستجو
نہ وہ کاوشیں، نہ وہ کاہشیں، مرے سر سے اب یہ ہوا گئی

مجھے آخر اب یہ خبر نہیں، مجھے کس نے دل سے بھلا دیا
کسی خود پسند کی یاد کیا، مرے دل سے یادِ خدا گئی!

خواجہ مسعود علی ذوقی

میرے آباؤ اجداد انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں کشمیر سے ترک وطن
کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ میں ۱۰ نومبر ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ اسکول کی ابتدائی
تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل
ہوا۔ اور ۱۹۲۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر یہیں سے بی۔اے، بی ٹی اور
ایم۔اے (اردو) کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ ملازمت کا آغاز ملاسن
ہائی اسکول گونڈہ سے کیا جو بعد میں انٹرمیڈیٹ کالج ہوگیا۔ اس ادارے میں سولہ سال
تک بالترتیب انگریزی کے استاد، اردو کے لیکچرار اور وائس پرنسپل کی حیثیت سے رہا۔
مارچ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ انٹر کالج بدایوں کا پرنسپل مقرر ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں ملازمت
سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۴۹ء میں بمبئی چلا گیا جہاں ہندوستان کی پہلی رنگین فلم
"آن" میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اور مشہور فلم "بیجو باورے"
میں ڈائلاگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ فلم انڈسٹری کے سماجی ماحول سے میں سمجھوتا
نہیں کرسکا اس لیے فلمی دنیا سے قطع تعلق کرکے بمبئی سے واپس چلا آیا اور جولائی ۱۹۵۳ء
سے مارچ ۱۹۵۸ء تک مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول علی گڑھ کا پرنسپل رہا۔ میں نے اپریل
۱۹۵۸ء میں اپنی خدمات یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس میں منتقل کرالیں اور نو سال
تک شعبۂ اردو میں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ اپریل ۱۹۶۷ء
میں ملازمت سے سبکدوش ہوگیا تو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مجھے سات ہزار روپے
سالانہ کا نیشنل اوارڈ (NATIONL AWARD) دے کر تین سال تک کے لیے

یونیورسٹی میں اعزازی استاد کی حیثیت سے دوبارہ علمی خدمت کا موقع دیا ہے۔
یوں تو میری دلچسپیوں کا دائرہ خاصہ وسیع ہے لیکن خاص طور پر کلاسیکل موسیقی، فنکار، اداکاری، ہدایت کاری اور شعر شاعری میرے محبوب ترین مشاغل ہیں۔ میں اب تک تقریباً پندرہ اسٹیج ڈرامے ڈائرکٹ کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے ممبئی، دہلی اور لکھنؤ اسٹیشنوں سے میر، غالب، اقبال، انشا اور رتن ناتھ سرشار کے غیر فانی کردار "خوجی" کے رول کامیابی کے ساتھ ادا کر چکا ہوں۔

بے رنگ سنّاٹوں کی شام

دن کے تشنہ ولولوں کی پیاس ہونٹوں پہ لیے
پھر آگئی بے رنگ سنّاٹوں کی شام
بتیاں جلتے ہی دل بجھنے لگا
دم بدم سینے میں دم گھٹنے لگا
اور دن کو
زندگی کی کشمکش میں
مصلحت کے جبر سے
خوں کے جتنے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی بے بسی
شام کی تنہائی میں زہر ہلاہل بن گئے
اور ظالم حافظہ اس زہر کو
قطرہ قطرہ روح کے زخموں میں ٹپکانے لگا!!

اندھیری رات

سناٹے کی چادر اوڑھے
خاموشی کی انگلی پکڑے
آدھی رات کی نیلی دیوی
سپنوں کی شرمیلی دلہن
نرم اندھیروں میں دھیرے دھیرے ڈول رہی ہے
تنہائی بے شبدوں کے بول رہی ہے
شبنم موتی رول رہی ہے
روح میں امرت گھول رہی ہے

آکاش پہ جگ مگ جگ مگ کرتے تارے
نیند کے مارے
بوجھل پلکوں کو رہ رہ کر جھپکاتے ہیں

تاریکی گیت سناتی ہے
سنّاٹے مسکاتے ہیں
تب رنگ بہ نگے لفظوں کے گھنگھرو باندھے
ماتھے پر گیتوں کا آنچل ڈالے
شعر کی پریاں
رقص کناں
شاعر کے دل میں در آتی ہیں
گنگا جمنی خوابوں کا ست رنگا ناچ دکھاتی ہیں
ذہن کے پر لگ جاتے ہیں
تخئیل جواں ہو جاتی ہے

تب رات کی رانی کی خوشبو
شبنم کی مدرا پی کر
اٹھلاتی بل کھاتی
بہکی بہکی
کنج کنج لہراتی ہے
یادوں کو مہکاتی ہے
چوٹوں کو سہلاتی ہے
پھر اوشا کی باہوں پر سر رکھ کر
سو جاتی ہے
نیندوں میں کھو جاتی ہے

زمیں کی بات کرو

برا ہوں میں کہ بھلا ہوں، مجھے خوشی یہ ہے
کہ جاہ و منصب و شہرت اگر نہیں نہ سہی
کچھ ایسا پیار بھی مجھ کو ملا ہے لوگوں سے
جو میری ذات سے ہے، اور صرف میرے لیے

یہی زمیں مرا مسکن، یہی مرا مدفن
اسی زمین کی مٹی، اسی زمیں کا مزاج
یہی زمین ہماری جراحتوں کا علاج
فلک کی بات نہ چھیڑو زمیں کی بات کرو
وہاں کے راگ نہ گاؤ، یہیں کی بات کرو

اسی زمین کا چھوٹا سا آدمی ہوں میں
مری پسند مری خواہشیں بھی چھوٹی ہیں
مآلِ زیست ہے ادنیٰ صداقتوں کی تلاش
متاعِ شوق ہے ارضی مسرتوں کا حصول

ملا نہ محلوں کا عیش و طرب تو کیا پروا؟

غریب خانے کی ارزاں فراغتیں تو ملیں
عظیم و دائم و رنگیں مسرتیں نہ سہی
حقیر و سادہ، گریزاں مسرتیں تو ملیں
نہیں نصیب گراں قدر نعمتیں نہ سہی
لب و دہن کی فرومایہ لذتیں تو ملیں

خدا گواہ فرومایہ لذتوں کے طفیل
کبھی کبھار نہیں، بارہا کیا محسوس
کہ جذبِ شوق میں سرشار، روح کے ہمراہ
کثیف جسم بھی اُڑنے لگا ستاروں میں!!

وفورِ شوق کے صدقے ملی ہے وہ لذّت
کبھی کبھی مجھے کافی کی گرم پیالی میں
جو بوسۂ لبِ جاناں میں پائی جاتی ہے
جو پائی جاتی ہے صہبائے پرتگالی میں!

جنھیں حقیر سمجھتے ہیں عام طور سے لوگ
متاعِ زیست وہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں
جھلستی، تپتی ہوئی دوپہر کی گرمی میں
نفیس، کوری صراحی سے آبِ سرد کے گھونٹ!

شدید بھوک لگی ہو تو سخت جاڑوں میں
تنورسے اٹھتی ہوئی نانِ گرم کی خوشبو!
خنک ہواؤں میں، بارش کے پہلے چھینٹے سے
خوشی میں چور، کنواری زمین کا سوندھا پن!
شمالی ہند کی زہرہ گداز سردی میں
غریب پرور و غم خوار دھوپ کی آغوش!
بڑوں کی سادگی، بچوں کی دلنشیں باتیں
مصیبتوں میں وفادار دوستوں کا خلوص!

نماز صبح میں میری سلامتی کے لیے
دعا کے بعد شریکِ حیات کے آنسو!
سحر کا نور، پپیہے کی خواب ناک آواز
شفق کے سرخ دھندلکوں میں ڈوبتی ہوئی شام!
حزیں اندھیروں میں ساون کی رات کا افسوں
دیارِ غیر سے دیرینہ ہمدموں کا سلام!
کہیں سے تہنیتِ سالِ نو کا تحفۂ خاص
کہیں سے شوقِ ملاقات کا حسیں پیغام!
کوئی صدا، کوئی خوشبو، کوئی نظر، کوئی لمس
کوئی ہنسی، کوئی نغمہ، کوئی ادا، کوئی خواب

متاعِ شوق یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں
انھیں سے میں نے سجایا نگارخانۂ شوق
انھیں سے میں نے بنائی ہے کیمیائے نشاط
انھیں سے میں نے پیا ہے خوشی کا آبِ حیات!

آواز و نور کا سنگیت

ہوائیں سنکیں،
ستاروں کے دیپ بجھنے لگے،
خنک ہواؤں میں شبنم کی تازگی دوڑی۔

دراز قامت و دیرینہ سال جنگل نے
لٹیں جھٹک کے اک انگڑائی لی،
زمین جاگی۔

پرند چونکے سرِ شاخ آشیانوں میں۔
پروں کو جھاڑ کے
اک ساتھ چہچہا اُٹھے
تو بھیرویں کے سُروں میں سرود بجنے لگا
سکوں میں جان پڑی
جنبشوں نے لب کھولے،

صدائیں جاگیں،
خموشی کا سحر ٹوٹ گیا ____

سحر کی دھندلی، پراسرار خوابگاہ کے گرد
اندھیرے چھٹنے لگے،
آسمان پگھلنے لگا،
افق کے پاس گلابی غبار اڑنے لگا ____

پلک جھپکتے ہی
آواز و نور کا افسوں
بلند و پست پہ سنگیت بن کے پھیل گیا!!

رفتار و گفتار

تری کھوئی کھوئی سی خاموش آنکھیں
اماوس کی راتوں کی مانند کالی
ہمالہ کی جھیلوں کی مانند گہری
ستاروں کو آئینہ دکھلا رہی ہیں

ترے ہونٹ ہیں یا شفق کی وہ لہریں
جو سورج کی کرنوں سے رنگین ہو کر
فضا کو گلابی شہابی بنائی
افق کے سمندر میں لہرا رہی ہیں
جو سورج کی کرنوں سے رنگین ہو کر

قیامت کی رفتار پائی ہے تو نے
سحر کی ملائم نشیلی ہوا میں
کبھی رقص کرتی کبھی لوچ کھاتی
بھری شاخ پھولوں کی لہرا رہی ہے

عجب نرم گفتار پائی ہے تو نے
دبے پاؤں چنچل ہوا چاندنی میں
لب جو کنول کے شگوفوں میں گھس کر
مہکتی ہوئی اوس چھلکا رہی ہے!!

ملے گا کیا مہ و انجم کی سیر سے ہم کو؟
زمیں کے ہیں ابھی درپیش مرحلے ہم کو

چھٹا تھا ساتھ ترا غم کے جس دوراہے پہ
اک عمر ہو گئی اس موڑ سے چلے ہم کو

یہ دل جو آج بظاہر ہے ایک سادہ ورق
اسی ورق پہ بہاروں نے خط لکھے ہم کو

نئے دلوں کے کئی اجنبی دیاروں میں
لیے پھرے ہیں ترے غم کے سلسلے ہم کو

ان آندھیوں میں تمھارا تو ذکر ہی کیا ہے
خود اپنے آپ سے صدیاں ہوئیں ملے ہم کو

چمن کی خاک سے گل لالہ بن کے پھوٹیں گے
بہار آج نظر بھر کے دیکھ لے ہم کو

ڈاکٹر منیب الرحمٰن

میں ۱۸ر جولائی ۱۹۲۴ء کو آگرہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم ڈبائی میں حاصل کی اور میرٹھ کالج سے انٹرمیجیٹ کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آیا۔ تاریخ سے ایم۔ اے کرنے کے بعد فارسی سے ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد لا کا امتحان دیا۔ ۱۹۴۴ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے رخصت ہونا پڑا۔ ایک سال تک ایک انجینیرنگ فیکٹری میں ملازمت کی۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں انگلینڈ پہنچا وہاں پر لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں جدید فارسی شاعری پر پی ایچ ڈی کے لیے کام کیا اور ۱۹۵۳ء میں وہاں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان واپس آگیا۔ اور آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے مقرر ہوں۔

میں نے ۱۹۴۸ء میں شاعری شروع کی۔ میری پہلی نظم 'ادبی دنیا' میں چھپی۔ اس کے بعد 'ہمایوں'، 'ادب لطیف'، 'ساقی' اور دوسرے رسالوں میں میری تخلیقات چھپتی رہیں۔ ۱۹۶۵ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے میرا مجموعہ 'بازدید' چھاپا۔ میں نے شیکسپیر کے جولیٹ سیریز اور انٹونی اینڈ کلوپیٹرا کا ترجمہ کیا۔

ڈراموں سے مجھے دلچسپی ہے اور میں نے مختلف ڈراموں کو سٹیج کیا۔

خواب

راہ مہتاب میں خوابوں کے پریشاں سائے
آگہی بن کے یکایک رگِ جاں تک آئے
میں نے چاہا تھا انھیں واقفِ اسرار کروں
ایک ہی پل کے لیے مائلِ گفتار کروں
سردیٔ غم میں وہ شعلوں کی زباں بن جائیں
شمعِ خلوت کی فغاں بن جائیں
لے گئی بادِ سحرگاہ اڑا کر ان کو
آہ ڈھونڈوں کہاں جا کر ان کو
کون سی شاخ سے پوچھوں میں نشیمن ان کا
ہر کرن بن گئی مسکن ان کا
وہ مجھے چھوڑ گئے اور میں تکتا ہی رہا
میں اکیلا تھا اکیلا ہی رہا

ایک رات

زندگی اک خلا سے لامحدود
دُور تک اک عمیق تنہائی
آہ ہم کس قدر فسردہ تھے

تم نے یوں جیسے بے خیالی میں
ناگہاں میرا ہاتھ تھام لیا
اور پھر زندگی میں پہلی بار
تم نے اس روز میرا نام لیا

نیند میں ڈوبی آہٹوں کے ساتھ
سوکھے سوکھے سے زرد رو پتے
ہولے ہولے زمیں پہ گرتے تھے

آہ ہم کس قدر فسردہ تھے

اظہار

اب ترے جسم سے اُٹھتی ہوئی خوشبو کی لپٹ
میرے احساس پہ آویزاں ہوئی جاتی ہے
گرم ہے کمرے کی خاموش فضا
تیرے عارض پہ پسینے کی نمی
ذہن میں لاتی ہے برسات کی بھیگی راتیں
نیم سگرٹ ترے پوروں میں دبی
سرخیٔ لب نے نشاں چھوڑ دیا ہے جس پہ
کہہ رہی ہے کہ حقیقت ہے فقط دودِ رواں
تو بھی خاموش ہے میں بھی چپ ہوں
اور ہم دونوں یہی سوچ رہے ہیں دل میں
کاش منت کشِ اظہار نہ ہونا پڑتا

آنکھیں

تیری دنبالہ دار آنکھوں میں
میں نے دیکھیں وہ پُرسکوں شامیں
جو مسافر کی مونسِ غم ہیں
دھوپ سے تمتماتے صحرا میں

تیری دنبالہ دار آنکھوں سے
مجھ کو ہوتا ہے یہ گماں اکثر
جیسے جھلے ہوئے دھندلکے میں
دب گیا ہو غبارِ راہگذر
کارواں کھو گئے ہوں ظلمت میں
ایک شعلہ کہیں چمکتا ہو
رات کی بے پناہ وسعت میں

اور یہ خواب ہائے نیم شبی
خوگرِ سوز و سازِ تشنہ لبی
اُٹھ کے گرداب وار ہوں پیہم
اس تجلی کے گرد رقص کناں
کف زناں، نغمہ ریز، زمزمہ خواں
صورتِ صوفیائے ملکِ عجم
اور پھر تھک تھکا کے سو جائیں
اپنے شب زندہ دار خیموں میں
تیری دنبالہ دار آنکھوں میں

سپنے

بتاؤ کیسے گزاریں یہ مختصر لمحے
یہ شب، ہماری محبت کی آخری شب ہے

وفورِ غم سے خیالوں کو غرقِ جام کریں؟
سکوتِ راز میں یادوں کو ہمکلام کریں؟
بچھائیں دیدۂ ویراں میں حسرتوں کی بساط؟
حریمِ دل میں شکستوں کا اہتمام کریں؟

نہیں نہیں یہ سزاوارِ اہلِ درد نہیں
اٹھو کہ پتوں کے مانند آندھیوں میں اڑیں
دیارِ دشت سے بے دست و پا گزر جائیں
پھر ایک ساتھ گریں، راہ میں بکھر جائیں

اسی طرح سے گذارے تھے ہم نے شام و سحر
یہی ہے آج بھی دل کی جسارتوں کا شعار
نہ ابتدا سے پشیماں، نہ انتہا سے فرار

چاند

کسی نے کہا چاند اک پھول ہے
مہکتا ہے جو گیسوئے یار میں
کسی نے کہا چاند اک داغ ہے
چمکتا ہے ہر شب دل زار میں

شاعر کی موت

وہ ایک پھول تھا سورج کو جو ترستا ہو

اسے ملی تھی شبانِ الم کی بینائی
غموں کی زندہ دلی، انجمن کی تنہائی

وہ چاہتا تھا کہ جوئے سحر میں غسل کرے
سکھائے اپنے پر و بال نرم کرنوں میں
تجلیوں سے سُنے نغمہ ہائے بیداری
سمیٹ لے شفق رنگ و نور آنکھوں میں

اسے مسل ہی دیا زندگی کے ہاتھوں نے

فضا میں کھول دیے گیسوئے فغاں ہم نے
اٹھائیں حسنِ پریشاں کی پتیاں ہم نے
صبا کی راہگذر میں انھیں بکھیر دیا
کہ زیرِ خرمنِ مہتاب دفن ہو جائیں
رہیں حضورِ محبّت رہینِ بے خبری
ردا پتوں کے اندھیرے میں جاکے سو جائیں

بے غبارِ رہِ ہجر جب قدم لوٹے
چمک رہا تھا افق پہ ستارۂ سحری

بازدید

تم جو آؤ تو دھندلکے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی کیفِ سرِ شام لیے
جب لرزتے ہیں صداؤں کے سمٹتے سائے
اور آنکھیں خلشِ حسرتِ ناکام لیے
ہر گذرتے ہوئے لمحے کو تکا کرتی ہیں
خود فریبی سے ہم آغوش رہا کرتی ہیں

تم جو آؤ تو اندھیرے میں لپٹ کر آؤ
مستیٔ بادِ سبک گام لیے
شبنمی شیشوں کو سہلائیں لچکتی شاخیں
اور مہتابِ زمستاں کوئی پیغام لیے
یوں چلا آئے کہ در باز نہ ہو
کوئی آواز نہ ہو

تم جو آؤ تو اُجالے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی لذتِ انجام لیے
جب تمنائیں کسی خوف سے چیخ اٹھتی ہیں
اور خاموشیٔ لب سیکڑوں ابہام لیے
ایک سنگین حقیقت میں بدل جاتی ہے
زندگی درد میں ڈھل جاتی ہے

مکافات

آؤ کہ میکدوں میں گزاریں تمام رات
تنہائیوں میں صحبتِ جام و سبو رہے
خاموشیوں میں کیفیتِ گفتگو رہے
یادوں کے پیچ و خم کو سنواریں تمام رات
زہرِ حیات دل میں اتاریں تمام رات

یہ در جو بند ہو تو کہیں اور اُٹھ چلیں
ظلمت بڑھے تو آتشِ غم تیز تر کریں
پروانہ وار جل کے بنیں خاکِ رہ نشیں
انبوہِ گرد باد میں رقصِ شرر کریں
افتادگی میں آرزوئے بال و پر کریں

لے جائیں کس کے پاس یہ داغِ خود آگہی
اے سوزِ ہجر کوئی ترا رازداں نہیں
یہ شہرِ ناشناس، یہ ویرانیٔ ہجوم
اس قافلے میں اہلِ نظر کا نشاں نہیں
سب اجنبی ہیں کوئی یہاں ہم زباں نہیں

بیٹھیں شفق کے سائے میں خونِ جگر پئیں
آؤ کہ رسمِ اہلِ خرابات ہے یہی
ہر عشقِ سخت جاں کی مکافات ہے یہی

آئینہ

دن نکلتے ہی آئینہ بولا
آؤ بے رنگ لوگ آ جاؤ
اس تکلف کی کیا ضرورت ہے
میں ہمیشہ سے جانتا ہوں تمھیں
پھر تعارف کی کیا ضرورت ہے
ایک دن ایک طفلک معصوم
میری آغوش میں مچلتا تھا
وہ سماں تم کو یاد ہو کہ نہ ہو

شام کو راہِ سرد و ویران پر
ایک سایہ قریب آتا ہے
اور کہتا ہے آؤ ساتھ چلیں
پاس کے رستوراں میں چائے پئیں
اور میں پوچھتا ہوں کیا مجھ سے
آشنا ہیں تمام اہلِ جہاں
میں کبھی عکس ہوں کبھی سایہ
اصل کی گفتگو میں سرگرداں
خود کو پہچاننے میں عمر کٹی
اور اپنے سے میں غیر رہا
سب نے دیکھا مجھے عجیب طرح
اپنی صورت کوئی نہ دیکھ سکا

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

میں ۹ اگست ۱۹۲۷ء میں اعظم گڑھ (یو۔پی) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ میرے والد مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، عربی و فارسی کے جید عالم تھے اور علوم اسلامی کے سلسلے میں ان کا نام ہندوستان کے علماء میں بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میری ابتدائی تعلیم مشرقی انداز کی ہوئی۔ انگریزی تعلیم ساتویں درجے سے شبلی کالج اعظم گڑھ میں شروع ہوئی۔ اسکول کے زمانے میں جن اساتذہ سے بطور خاص متاثر ہوا ان میں بشیر احمد صدیقی صاحب بھی ہیں جو اس زمانے میں کالج کے پرنسپل تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے متاثر ہو کر میں ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا۔ ۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۴۹ء میں بی اے اور ۱۹۵۱ء میں ایم۔اے (اردو) کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے ایم اے کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی مسلم یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا جس کا سلسلہ ۱۹۵۳ء تک جاری رہا۔ زمانۂ طالب علمی میں انجمن اردوئے معلی کا سکریٹری رہا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی۔ علی گڑھ میگزین کا مدیر بھی رہا۔

شاعری کی ابتدا ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ سب سے پہلی نظم "نقشِ ناتمام"

تھی جو اسی زمانے میں نیا دور (بنگلور) میں شائع ہوئی۔ ۱۹۴۸ء سے تنقید کی طرف بھی متوجہ ہوا اور آتش کی شاعری پر ایک طویل مقالہ لکھا جو بالاقساط "ادیب" میں شائع ہوا

۱۹۵۳ء میں شعبۂ اردو میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں ترقی پسند تحریک پر تحقیقی و تنقیدی مقالہ لکھا جس پر ڈاکٹریٹ تفویض کی گئی۔ ۱۹۶۶ء میں میرا تقرر ریڈر کی حیثیت سے ہوا اور تا حال یہی خدمت انجام دے رہا ہوں۔

جو کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کاغذی پیرہن (پہلا مجموعہ کلام)
(۲) فکر و فن (تنقیدی مضامین)
(۳) مقدمہ کلام آتش (تنقید)
(۴) نوائے ظفر (تنقید)
(۵) نیا عہد نامہ (دوسرا مجموعہ کلام)
(۶) زاویۂ نگاہ (تنقیدی مضامین)

علی گڑھ

خلیل الرحمن اعظمی

دوسری ملاقات

کہہ نہیں سکتا کہاں سے آئے ہو، تم کون ہو
ایسا لگتا ہے کہ یہ صورت ہے پہچانی ہوئی

خاک میں روندا ہوا چہرہ مگر اک دل کشی
آنکھ میں ہلکا تبسم، دل میں کوئی ٹیس سی
پاؤں سے لپٹی ہوئی بیتے ہوئے لمحوں کی گرد
پیرہن کے چاک میں گہرے غموں کی تازگی

پرسشِ غم پر بھی کہہ سکنا نہ اپنے جی کا حال
کچھ کہا تو بس یہی کہ تم پہ کچھ بیتی نہیں
راہ میں چلتے ہوئے ٹھوکر لگی اور گر پڑے
یونہی کانٹے چبھ گئے ہیں، پھٹ گئی ہے آستیں

یاد آتا ہے کہ تم مجھ سے ملے تھے پہلی بار
اک کہانی میں نہ جانے کس کی تھی لکھی ہوئی
اور میں نے اس طرح کے آدمی کو دیکھ کر
دل میں سوچا تھا کہ اس سے آرزو لوں دوستی

سوداگر

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ پھر
کاسۂ چشم لے لے کے ایک ایک چہرہ تکوں گا
دفتروں، کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جا کر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا

میری آرامِ جاں!
مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو
آج کی شام لوٹوں گا جب
بیچ کر اپنے شفاف دل کا لہو
اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لیے
تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر
میں کہاں جاؤں گا؟
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا ——
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا ——

ذاتیات

جو مجھ پہ بیتی ہے
اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا
جو دکھ اٹھائے ہیں،
جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں
ان کو کہنے کا مجھ کو یارا نہیں ہے
میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں
داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگذشت میری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے، لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
تو راہ چلتے میں ٹوک کر مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے

لمحے کی موت

کچھ دور تلک،
کچھ دور تلک،
وہ لمحہ اُس کے ساتھ چلا
جب اس نے دل میں یہ سوچا
یہ گرتی دیواریں، یہ دھواں
یہ کالی چھتیں، یہ اندھے دیے
سنولائے ہوئے سارے چہرے
اب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے

جب نگر نگر کی سیّاحی
ان ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کی آوارہ گردی
ہنستے جسم، چھلکتے پیالوں کی موسیقی
اس کے کام نہ آئی

اُس نے کہا: اب آؤ لوٹ چلیں

اک شام وہ اپنے گھر پہنچا
اور اُس سے ملنے کو آئے
سب ساتھی اس کے بچپن کے
سب کہنے لگے:
اُن جگمگ کرتے شہروں کا
کچھ حال بتاؤ،
اپنے سفر کی کچھ روداد کہو

وہ خاموش رہا:
وہ دیکھ رہا تھا اُس میلے سے طاق کو
جس پہ ایک گھڑی رکھی تھی
اور وہ بند پڑی تھی

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
ایک دن مجھے بھی کوئی گیان ہو گا

مگر
جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی

اور بھی یہ بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

بدلتے موسم

وہی پیارے مدھر الفاظ، میٹھی رس بھری باتیں
وہی روشن رو پہلے دن، وہی مہکی ہوئی راتیں
وہی میرا یہ کہنا تم بہت ہی خوبصورت ہو
تمہارے لب پہ یہ فقرہ کہ تم ہی میری قسمت ہو
وہی میرا پرانا گیت تم بن جی نہیں سکتا
میں ان ہونٹوں کی پی کر اب کوئی مے پی نہیں سکتا

یہ سب کچھ ٹھیک ہے پر اس سے جی گھبرا بھی جاتا ہے
اگر موسم نہ بدلے آدمی اکتا بھی جاتا ہے
کبھی یونہی سہی میں اور کو اپنا بنا لیتا
تمہارے دل کو ٹھکراتا، تمہاری بددعا لیتا
کبھی میں بھی یہ سنتا تم بڑے ہی بے مروت ہو
کبھی میں بھی یہ کہتا تم تو سرتا پا حماقت ہو
اب آؤ یہ بھی کر دیکھیں تو جینے کا مزا آئے
کوئی کھڑکی کھلے اس گھر کی اور تازہ ہوا آئے

یہ الگ بات کہ ہر سمت سے پتھر آیا
سربلندی کا بھی الزام مرے سر آیا

زندگی چھوڑنے آئی مجھے دروازے تک
رات کے پچھلے پہر میں جو کبھی گھر آیا

بس دعا ہے کہ الٰہی یہ کوئی خواب نہ ہو
کوئی سایہ مرے سائے کے برابر آیا

بارہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں
بارہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا

کیا کہیں اب تو یہ عادت نہیں جاتی ہم سے
جھوٹ بھی بولے تو سچ بن کے زباں پر آیا

میں نہیں حق میں زمانے کو برا کہنے کے
اب کے میں کھا کے زمانے کی جو ٹھوکر آیا

سرخیِ مے بھی ٹھہرتی نہیں ہر چہرے پہ
بوالہوس بھی اسی مے خانے سے ہو کر آیا

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سا پکارتا ہوں

سونا ہوں کُریدکر تو دیکھو
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں

لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت
ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں

یوں ربط تو ہے نشاط سے بھی
دراصل میں غم سے آشنا ہوں

صحبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں

دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں میں دعا ہوں

کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں

تقدیرِ جنوں پہ چُپ رہا میں
تعبیرِ جنوں پہ رو رہا ہوں

ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

سوتے سوتے چونک پڑے ہم، خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈ رہا ہو، ایسا اک رستا دیکھا

دُور سے اک پرچھائیں دیکھی اپنے سے ملتی جُلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرا دیکھا

سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا

سوکھی دھرتی سُن لیتی ہے پانی کی آوازوں کو
پیاسی آنکھیں بول اُٹھتی ہیں ہم نے اک دریا دیکھا

آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو جب ہم نے جلتا دیکھا

چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے اُن کا بھی سایہ دیکھا

جن سے مل کر لوٹے ہیں اب ان کی بات نہیں کرتے
جن کا نام بہت سنتے تھے، ہم نے ان کو جا دیکھا

رات وہی پھر بات ہوئی نا، ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے سے شور سا اک اُٹھتا دیکھا

کہاں کھو گئی روح کی روشنی
بتا میری راتوں کی آوارگی!

میں جب لمحے لمحے کا رس پی چکا
تو کچھ اور جاگی مری تشنگی

اگر گھر سے نکلیں تو پھر تیز دھوپ
مگر گھر میں ڈستی ہوئی تیرگی

غموں پر تبسم کی ڈالی نقاب
تو ہونے لگی اور بے پردگی

مگر جاگنا اپنی قسمت میں تھا
بلاتی رہی نیند کی جل پری

جو تعمیر کی کنجِ تنہائی میں
وہ دیوار اپنے ہی سر پہ گری

نہ جانے جلے کون سی آگ میں
ہے کیوں سر پہ یہ راکھ بکھری ہوئی

ہوئی بارشِ سنگ اس شہر میں
ہمیں بھی ملا حقِ ہمسائگی

گزاری ہے کتنوں نے اس طرح عمر
بالاقساط کرتے رہے خودکشی

ہیں کچھ لوگ جن کو کوئی غم نہیں
عجب طرفہ نعمت ہے یہ بے حسی

کوئی وقت بتلا کہ تجھ سے ملوں
مری دوڑتی بھاگتی زندگی

جنھیں ساتھ چلنا ہو چلتے رہیں
گھڑی وقت کی کس کی خاطر رکی

میں جیتا تو پائی کسی سے نہ داد
میں ہارا تو گھر پہ بڑی بھیڑ تھی

ہوا ہم پہ اب ان کا سایہ حرام
تھی جن بادلوں سے کبھی دوستی

مجھے یہ اندھیرے نگل جائیں گے
کہاں ہے تو اے میرے سورج مکھی!

نکالے گئے اس کے معنی ہزار
عجب چیز تھی اک مری خامشی

ڈاکٹر وحید اختر

۱۲ اگست ۱۹۳۵ء کو ریاست حیدرآباد کے شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔
آبائی وطن اودھ کا قصبہ نصیر آباد (جائس) ہے مگر والد ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد میں مقیم رہے یہیں سے میں نے ۱۹۵۰ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ پھر سائنس اور ریاضیات سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں حیدرآباد چلا گیا جہاں آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا فلسفہ، نفسیات اور سیاسیات کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں بی۔اے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب کیا اور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن آئی۔ ۱۹۵۶ء میں درجہ اول میں امتیاز کے ساتھ ایم۔اے کیا۔ ۱۹۵۹ء تک پی۔ایچ۔ڈی کے لیے تصوف کے مشہور محقق اور عالم ڈاکٹر میر ولی الدین کی نگرانی میں خواجہ میر درد کے تصوف پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹریٹ ملنے کے فوری بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جنرل ایجوکیشن میں فلسفے کی تدریس کے لیے تقرر ہو گیا۔ اس وقت شعبۂ فلسفہ میں تدریس و تحقیق کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

اسکول کے زمانے سے ادب و شعر سے شغف تھا اس لیے میں نے انٹر کے بعد اس "شوق فضول" کی خاطر سائنس اور ریاضی جن سے میرے ذہن کو گہری مناسبت تھی، چھوڑ کر فلسفے کا انتخاب کیا جبکہ پہلی صورت میں معاشی مستقبل کی ضمانت تھی اور دوسری صورت میں امکانات مبہم اور مایوس کن۔ اورنگ آباد عثمانیہ کالج کے رسالے "نورس" (جس کی تاسیس بابائے اردو

مولوی عبدالحق نے کی تھی) اردو اور انگریزی دونوں کا ۱۹۵۴-۵۵ء میں مدیر رہا۔ جامعہ عثمانیہ کے رسالے "مجلّۂ عثمانیہ" کا ۱۹۵۴-۵۵ء میں ایڈیٹر رہا۔ کچھ مدت تک حیدرآباد کے ادبی رسالے "صبا" کی ادارت سے وابستہ رہا۔ اسی زمانے میں شاعری کے ساتھ تنقیدی مضامین بھی لکھنے شروع کیے۔

شاعری کا مجموعہ "پتھروں کا مغنّی" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا جس پر یو۔پی گورنمنٹ نے اردو کتابوں کا سب سے بڑا اعزاز "غالب انعام" ۱۹۶۷ء میں دیا۔ اس سے قبل حیدرآباد کے چند اور شعرا کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے ادبی اعزاز سے نوازا تھا۔

میرے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "فلسفہ اور ادبی تنقید" کے نام سے نصرت پبلشرز لکھنؤ کے اہتمام سے شائع ہونے والا ہے "خواجہ میر درد تصوف اور شاعری" کے عنوان سے میرے تحقیقی مقالے کے مواد پر مبنی کتاب اضافوں کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ شائع کر رہی ہے۔ غالب صدی تقاریب کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کمیٹی نے مجھے غالب کی ذہنی و فکری سرچشموں پر کتاب لکھنے کا کام تفویض کیا تھا۔ یہ کتاب بھی جلد شائع ہونے والی ہے۔ ایک اور کتاب "تصوف کے بنیادی تصورات" کا مسودہ مکمل صورت میں رکھا ہوا پبلشر کے انتظار میں ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ فلسفے کے مختلف مسائل پر انگریزی میں کئی مضامین لکھے ہیں۔

علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے لیے "ادب لطیف" اور "مکتوب نگاری" پر دو ابواب لکھے ہیں جو اس تاریخ کی چوتھی اور پانچویں جلد میں شائع ہوں گے۔

اس وقت منسٹری آف ایجوکیشن کے ترقی اردو بورڈ کے لیے فالکن برگ (FALCKEN BERG) کی "تاریخ فلسفہ جدید" کا ترجمہ کر رہا ہوں۔ ایک طویل نظم "شہر ہوس" تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہے جس کے چند ابواب ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

پتھروں کا مغنّی

مطربِ خوش نوا زندگی کے حسیں گیت گاتا رہا
اس کی آواز پر انجمن جھوم اٹھی
اس نے جب زخمۂ دل کو زباں بخش دی
سننے والوں نے بے ساختہ آہ کی
عشق کے ساز پر جب ہوا زخمہ زن
شورِ تحسیں میں خود اس کی آواز دب سی گئی

مطربِ خوش نوا پھر بھی تنہا رہا

تشنگیٔ مشام اس کو بادِ صبا کی طرح گُل بہ گُل لے گئی
کاسۂ چشم نے پرتوِ گل بھی پایا نہیں
درد اس کا کسی محرمِ درد کے واسطے
در بہ در، شہر در شہر پھرتا رہا

دادِ تحسین کے ہنگامۂ ذوقِ کُش میں اُسے
ہر طرف سے ملامت کے پتھر ملے
مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
پتھروں کو زباں تو ملی، پر تکلم نہیں
پتھروں کو ملے ہونٹ، لیکن تبسم نہیں
پتھروں کو ملی آنکھ، لیکن نظر کون دیتا انھیں
پتھروں کو ملے کان، پر ذوقِ نغمہ نہیں
پتھروں کو خد و خال انساں ملے، دولتِ درد و غم کب ملی
پتھروں کو حسیں صورتیں تو ملیں، دل نہیں مل سکا
پتھروں کو ملے پاؤں، پر اعتمادِ سفر کون دے
پتھروں کو ملے ہاتھ، پہ عزمِ تیشہ زنی کون دے

سنگ سنتے ہیں، لیکن سمجھتے نہیں
دیکھتے ہیں، مگر فرق کرتے نہیں
بات کرتے ہیں، محسوس کرتے نہیں
ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن پگھلتے نہیں
گرد بن کر یہ اڑ جائیں، سانچوں میں ڈھلتے نہیں

مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
مطربِ خوشنوا پتھروں کو سناتا رہا دردِ دل
اپنا غم

ان کا غم
سب کا غم

پتھروں نے سُنا اور چپ چاپ ہنستے رہے
پتھروں کی اسی انجمن کا مغنی ہوں میں
اور بے درد، بے حس، ستم گار پتھر سنیں گے کبھی
ان کا وہ مطرب خوش نوا
شکوہ سنج زماں
اپنے نغمات کی آگ میں جل گیا
یا پھر اُن ہی کی مانند پتھر کا بُت بن گیا

دعائے نغمہ

میں کہ اک جنتِ نادیدہ کا افسانہ طراز
اپنے بچھڑے ہوئے خوابوں کو صدا دیتا ہوں
لوٹ کر زیست نے بخشا مرے غم کو وہ گداز
راہزن مانگے تو دل راہِ خدا دیتا ہوں
زخم کاری ہو تو قاتل کو دعا دیتا ہوں
نقرہ و زر ہی میں تلتا ہے جہاں ذوقِ نظر
قیمتِ حسنِ نظر اور بڑھا دیتا ہوں
کوئی دل ٹوٹے تو ہوتی ہے مرے دل کو خبر
کوئی بھی چشم ہو نم، ہے وہ مرا دیدۂ تر

اہلِ دل، اہلِ نظر قیمتِ فن جانتے ہیں
خون رونے ہی سے تخلیق پہ آتا ہے نکھار
شپرہ چشم کہاں شمع کو گردانتے ہیں

سینۂ سنگ ہے محرومِ متاعِ گلزار
آبِ شمشیر نہیں چارہ گرِ زخمِ بہار
مرا فن داد طلب ہے غمِ انساں تجھ سے
اس لطافت پہ کہ دھڑکن دلِ نازک پہ ہے بار
آشنا پھر بھی ہوں اے شورشِ دوراں تجھ سے
عمر بھر ساتھ نبھانے کا ہے پیماں تجھ سے

ثمرِ محنتِ آدم سے نکھرتا گلزار
بن کے عنواں مری نظموں کو صدا دیتا ہے
تپشِ تیشۂ ہمت سے پگھلتا کہسار
دولتِ بطنِ زمیں مجھ کو دکھا دیتا ہے
دودھ کی نہر چٹانوں میں بہا دیتا ہے
ظلمتِ خاک سے اٹھتی ہوئی فصلوں کا چراغ
شمعِ افکار کی لو اور بڑھا دیتا ہے
گرمیٔ خونِ شہیداں سے ہیں گردش میں ایاغ
خاک کے ذروں سے ملتے ہیں ستاروں کے سراغ

گونجتے شہر رواں اور دواں راہ گذر
کارخانوں کے دھڑکتے ہوئے سینوں کا دھواں
مکتبِ اہلِ ہنر، مدرسۂ فکر و نظر
زندگانی سے چھلکتے ہوئے میدان و مکاں

عرقِ جہد سے مہکی ہوئی کشتِ دہقاں
دستِ محنت میں کھلتی ہوئی روشن دھاتیں
پائے رہرو سے لپٹتی ہوئی منزل کا نشاں
جاگتے دوڑتے دن، نیند میں لپٹی راتیں
روز لاتی ہیں سخنور کے لیے سوغاتیں

آتشِ عشق کی حدت سے تپائے ہوئے دل
اپنی گرمی مرے افکار کو دے دیتے ہیں
یادِ محبوب میں آنکھوں سے بہائے ہوئے دل
اپنا اخلاص مرے پیار کو دے دیتے ہیں
اپنی دھڑکن مرے اشعار کو دے دیتے ہیں
چشمِ جانانہ کے در پردہ فسوں سازِ سخن
نطق اپنا مری گفتار کو دے دیتے ہیں
ہے وہی موجِ صبا جس سے ہو آسودہ چمن
ہے وہی گیت جو بن جائے دلوں کی دھڑکن

اے غمِ زیست، تری راہبری کیا کہیے
شوق پر تنگ ہیں کیوں شمس و قمر کے جادے
خوں بہا مانگتی ہے، دیدہ وری کیا کہیے

وحشتِ عشق کو آدابِ وفا سکھلا دے
دشت پیما جو کیا، حوصلۂ دریا دے
طرزِ دلداریٔ امواجِ صبا مل جائے
نہ سہی آبِ بقا، زہرِ غمِ دنیا دے
سخن آگاہ کو نغمے کی رضا مل جائے
دل سپردار دعا دے تو خدا مل جائے

عہد آشوب

یہ عہدِ کرب، یہ تشکیک و انتشار کا دور
دماغ دیتے ہیں لو تیرگی کے دامن میں
اتر رہا ہے خمارِ شرابِ عہدِ کہن
سمجھ رہی ہیں فضا کو ابھی نئی شمعیں
خموش ہوتے چلے ہیں چراغِ آخرِ شب
دلوں کے داغ ہیں لے دے کے روشنی کے لیے

تمام رات کی بیداریوں نے چھین لیا
بچا بچا کے رکھا تھا جو خونِ تشنہ لبی
اسی کو صبح کا تارا سمجھ لیا ہوتا
مژہ تک آ نہ سکا میرا ماہِ نیم شبی
فریضۂ سحری کے لیے وضو کیا ہو
اب اشک ہی نہیں اس طرفہ بندگی کے لیے

سیاہیوں میں بھٹک کر افق سے تابہ افق
نظر لڑی بھی ٹوٹے ہوئے ستاروں سے
کرم کی آس دلانے کے ساتھ ہی جیسے
شکستہ جام بھی چھن جائیں بادہ خواروں سے
کھڑے ہیں کاسہ بکف ظلمتوں کی چوکھٹ پر
مہ و ستارہ و خورشید روشنی کے لیے

فریب کھائے ہیں اتنے بہ نامِ فصلِ بہار
اب اعتبارِ مسیحائیٔ صبا بھی نہیں
حصارِ لالہ و گل توڑ کر کدھر جائیں
جو قید بھی نہیں پرواز آشنا بھی نہیں
عبارت آج ہے زخموں کے مسکرانے سے
شگفتِ گل کبھی تشبیہ تھی ہنسی کے لیے

چمن سیاستِ گلچیں سے ہے خزاں آثار
نسیمِ صبح پہ ذربنار ہے، سموم آزاد
وہ جن پہ آج بھی ثابت ہے جرمِ بےگنہی
قفس میں کاٹ رہے ہیں سزائے بےمیعاد
حضورِ مرگ [illegible] حیات رو رو کر

خطا معاف کراتی ہے زندگی کے لیے

علوم و نغمہ و تہذیب و شعر کے خالق
طلا و سیم کے بازار میں ہیں جنسِ حقیر
پیمبرانِ زمانہ، مزاج دانِ حیات
بتانِ جہل و توہم کی زلف میں ہیں اسیر
جبینِ عظمتِ انساں کے راز داں کعبے
صنم کدوں میں بھٹکتے ہیں زندگی کے لیے

کچھ اس طرح سے لٹے رہروانِ راہِ حیات
عقیدتوں کا سہارا نہ تکیۂ تقدیر
ہر اک امید گریزاں، ہر ایک خواب تباہ
جو آج دوڑ کے ہوں بھی تو کس کے دامنگیر
ہزاروں صدیوں نے دی تھیں جو گل شدہ شمعیں
پڑا جو وقت، نہ کام آئیں روشنی کے لیے

بہت ہی سخت ہے یہ جادۂ ثباتِ طلب
ہوا نہ راہنماؤں کے ساتھ چھوٹ گئے

جنھوں نے دی تمھیں پناہیں قدم قدم پہ کبھی
وہ آسرے بھی مثالِ حباب ٹوٹ گئے
کچھ ایسی منزلِ دشوارِ آگہی ہے قریب
خضر بھی سر بہ گریباں ہے رہبری کے لیے

یہ کس مقام پہ درماندگی نے روکا ہے
نظر کے سامنے ہے منزلِ طلب کا سواد
سمیٹنا ہے ابھی تجربوں کو دامن میں
کہ خستگیٔ جنوں بھی ہے مرحلہ ایجاد
دھواں دھواں سے مناظر تھکی تھکی سی نظر
یہی تو حربے ہیں اب سعیٔ زندگی کے لیے

پکارتی ہے دلِ کائنات کی دھڑکن
یہی نہ معرکۂ خیر و شر کی منزل ہو
بلند ہو کے بھی موجیں پلٹ پلٹ آئیں
یہیں کہیں نہ یمِ کشمکش کا ساحل ہو
اٹھا رہا ہے نیا جام ساقیٔ دوراں
جو ہوگا فتح کی تقریب آخری کے لیے

شعاع ریز نہیں دستِ وقت میں ساغر
چمک رہا ہے ہماری ہی تشنگی کا لہو
ہر ایک ریزۂ مینا بنے گا پیمانہ
ہزار بار بھی ٹوٹے جو خونِ دل کا سبو
یہ میکدہ تو نہ اجڑے گا لٹ کے بھی سو بار
ہزار راہ ہیں تسکین تشنگی کے لیے

صحرائے سکوت

کوئی یہ کہتا ہے سرگوشیوں میں "چپ سو جاؤ"
زبان داں ہے کوئی اور نہ کوئی محرمِ راز
نہ کوئی آنکھ ہے بینا نہ کوئی قلب گداز
تمہارے چاروں طرف خامشی کے پہرے ہیں
کہو نہ کچھ کہ ہیں دیواریں گوش بر آواز
کہو نہ کچھ کہ ہیں دروازے آنکھ کھولے ہوئے
دریچے دزدِ معانیٔ ناشنیدہ ہیں"
ہیں یوں تو آدمی بھی سنگ و خشت کے پیکر
جو لفظ سلطنتِ خامشی میں ہو ممنوع
اس ایک لفظ کو سننے کے واسطے ہر دم
ہیں سنگ و خشت تمام آنکھ کان کھولے ہوئے
کہ ایک لفظ بھی نکلے تو چھین لیں منہ سے

نظر نظر سے یہ کہتی ہے "آنکھ بند کرو"
زباں زباں سے یہ کہتی ہے "کوئی کچھ نہ کہو"

ہر ایک لفظ کی منّت "ہم ان کہے اچھے"
معانی کی یہ لجاجت "ہمیں زباں نہ ملے"

خیال جوڑنا چاہے صدا سے گر رشتہ
تو بات ہی نہیں کٹتی زبان کٹتی ہے
وہی خموشی جو کرتی ہے ضبط کی تلقین
ذرا سے زخم پہ مجروح ناگ کے مانند
صدا کو ڈسنے کی خاطر وہیں پلٹتی ہے
جہاں جہاں بھی جلیں لفظ کے سنہرے چراغ
اُدھر اُدھر کو وہ کرگٹ درندہاں جھپٹتی ہے

جہاں بھی جاؤ، وہی خامشی کی گونج کا شور
یہ گونج ہے وہ اندھیرا ڈراونا جنگل
جہاں زبان ہے گُم، لفظ گم، معانی گُم
دل و دماغ و نظر کی ہر اک کہانی گم

بہت زمانے سے ہم نشست خامشی میں گُم
زبان و لفظ کے رشتوں کی جستجو میں ہیں
اندھیری راتیں چراغوں کی آرزو میں ہیں
مگر یہ کھوکھلی آوازوں کا مہیب سکوت
ریا کا زہر پیے لفظ کا لیے تابوت

بتا رہا ہے کہ آزادیٔ اشاعت کے لیے
یہ چاہتا ہے کہ لفظوں کو گہری قبروں میں
کچھ اس طرح سے کرے دفن پھر وہ اٹھ نہ سکیں
یہ چاہتا ہے معانی کو زہر ہی دے کر
جلائے ایسی چتا پر کہ پھر وہ بچ نہ سکیں
یہ چاہتا ہے کہ اس سازشِ گناہ میں ہم
شریک ہو کے گلا اپنے آپ ہی کاٹیں

بہت زمانے سے اس دشتِ خامشی میں ہم
یہ دیکھتے ہیں کہ ہر روز ایک زندہ لفظ
کسی گناہ کے تاریک قید خانے میں
سسک سسک کے خموشی کا زہر پیتا ہے
پھر اس کے بعد بہت سارے بے زباں عفریت
قرونِ وسطیٰ کے گونگے غلاموں کے مانند
جھکائے آنکھ کفن اس کا قطع کرتے ہیں
کہ حاکموں کے گناہوں کا پردہ رہ جائے

بہت زمانے سے اس دشت خامشی میں ہم
یہ دیکھتے ہیں معانی کی اک دلہن ہر روز
زباں کی سیج سے تشنہ اٹھائی جاتی ہے
حضورِ خامشی لب بستہ لائی جاتی ہے

دبوچ کر اُسے ہاتھوں میں اپنے خاموشی
اشارہ گونگے غلاموں کی سمت کرتی ہے
جو اُس پہ ایسے جھپٹتے ہیں جیسے لاش پہ گدھ
لباس اس کا سرِ بزم اُتارا جاتا ہے
غلام اس کے اچھوتے بدن پہ ہنستے ہیں
خموشی ناخن و دنداں سے اس کو نوچتی ہے
اور اس پہ کھوکھلی آوازوں کا مہیب سکوت
ہزاروں قہقہوں کے تازیانے مارتا ہے

بہت زمانے سے اس دشتِ خامشی میں ہم
یہ دیکھتے ہیں زباں کی کنواری ماں ہر روز
کسی صلیب پہ لٹکی صدا کی لاش تلے
ازل کا کرب لیے آنکھ میں، سسکتی ہے
فغاں قریب کھڑی بے بسی سے تکتی ہے

کھنڈر، آسیب اور پھول

یہ بھی طلسم ہوش ربا ہے
زندہ، چلتے پھرتے، ہنستے روتے، نفرت اور محبت کرتے انساں
صرف ہیولے اور دھوئیں کے مرغولے ہیں

ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے توہم کے کاندھوں پر لادے سست قدم واماندہ
خاک بسر، داماں دریدہ، زخمی پیروں سے کانٹوں انگاروں پہ چلتے رہتے ہیں
ہم سب ایک قبرستان کے آوارہ بھوت ہیں
جن کے جسم تو ہاتھ لگانے سے تحلیل خلا میں ہوں
جن کی روحوں کا ظاہر سے ظاہر گوشہ ہاتھ نہ آئے

ہم کو ماضی سے ورثے میں کہنہ قبریں، گرتے ملبے اور آسیب زدہ کھنڈروں کے ڈھیر ملے ہیں
وہ روشن شب تاب دیے جن سے ماضی کو نور ملا تھا
اس آسیب زدہ ماحول میں یوں جلتے ہیں
جیسے اک پرہول بیاباں کے تیرہ سناٹے میں
کچھ بھوتوں نے
رہ گم کردہ سیاحوں کو بھٹکانے کی خاطر آگ جلائی ہو

اب یہ اُجاڑ سے صرف دھواں ہیں
اور آسیب زدہ کھنڈروں کی چھت کے چٹختے شہتیروں کے شور میں گونجی ہنستا ہے
بھرتا چونا، گرتی مٹی، نیم معلق دیوار و در
چپکے چپکے روتے ہیں
طاقوں کے خاموش دیے ظلمت کو بڑھاوا دیتے ہیں
صحن کے صدہا سال پرانے بوڑھے پیڑ
قبروں کے بیدرد مجاور بن کر لاشوں پر سوکھے پتوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں

ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے انا کے دوش پہ لادے
اک قبرستان کی پُرہول اداسی سے اکتائے ہوئے
ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں
منتظر اک انبوہ ہجوم آنکھوں کے خالی کاسے کھولے ہر سو دیکھ رہا ہے
جانے کب کوئی آئے گا جو اپنے دامن کی ہوا سے آگ لگا کر
بھوتوں کا جلنا دیکھے گا
اور بھیانک سائے گلے مل مل کر کھوکھلی آوازوں میں روئیں گے

اس منظر میں جانے پھر ایسا کوئی آئے کہ نہ آئے
جو ویران مایوس نگاہوں کی خالی جھولی پھیلائے
راکھ میں پھول کریدے گا

زبان کی موت

ہزاروں اموات نوحہ خواں ہیں کہ اک زباں پہ ہے نزع طاری
حروف و الفاظ سر بہ زانو
خموش ہے اک جہانِ معنی
کہ اس کے باسی
تلاشِ گندم میں اپنے شہروں کی فاقہ کش عافیت کو تج کر
نئے جہانوں کے اجنبی راستوں پہ آنکھوں میں پیاس لے کر بھٹک رہے ہیں
نیاپن کی روشنی میں لکھی نئی زبانیں چمک رہی ہیں
جلاوطن لفظ و معانی کو سور کرتی وسیع سڑکیں نگل رہی ہیں

خموش ہے اک جہانِ معنی
کہ اس کی باسی
نئی زبانوں کے شور و غل سے وطن میں بھی اجنبی ہوئے ہیں
وہ اپنے شہرِ زباں میں بھی بے زباں ہوئے ہیں
جو بات کرتے تھے اب وہ شہرِ دیار و دیوار و در ہیں ساکت
جو محرمِ مدعا تھے وہ دشت و کوہ و صحرا صدا کے گونگے بنے ہوئے ہیں
جو حرف کی آنچ سے پگھلتے تھے وہ شجر او حجر ہیں ساکت

پرانی آبادیوں کے رستے شکستہ کھنڈروں میں کھو گئے ہیں
وہ محل و ایوان و طاق و گنبد جہاں سے اموات کا سمندر ابل رہا ہے
اجڑ چکے ہیں

وہ شاہراہیں، وہ تنگ گلیاں، وہ سیڑھیاں، چوکھٹیں، دریچے
سرمہ سرائیں، غلام گردش، وسیع دالان، ہنستے آنگن
مکانوں کے کونے، ابدیں کے گوشے
جو لفظ کو دے رہے تھے معنی
جو صوت کو دے رہے تھے نغمہ
خموش ویرانیوں کے مرقد میں اپنی دنیا کو دفن کر کے
سکوت کی چشم حسرت آگیں سے اپنی بیت پہ رو رہے ہیں

ہزاروں اموات نوحہ خواں ہیں کہ ان کا پرساں نہیں ہے کوئی
ہزاروں الفاظ کھو کھلے ہیں کہ ان کے معنی تلاش نان جویں میں اپنا لباس بدلے بھٹک رہے ہیں
زبان سے ہے شکم کا رشتہ
ہیں لفظ کشکول نان وگندم
نئی زبانوں نے لفظ جہد معاش میں بے زبان لفظوں کو روندتے ہیں
نئی زبانوں کی سلطنت میں کسے پڑی ہے جو اپنے لفظوں کو چھوڑ کر دوسروں
کے لفظوں کو دے معانی
کسے پڑی ہے جو فاقہ کش اور برہنہ معنی کو الفاظ کے پیرہن سے ڈھانپے
ہمارے الفاظ مر رہے ہیں ہم اپنی سانسوں کو گن رہے ہیں
ہمارے بعد آنے والی نسلیں
ہمارے الفاظ اور معنی کی قبر کو دیکھ کر کہیں گی
کہ آج سے چند سال پہلے یہ لفظ و معنی بھی بولتے تھے
صلیب جمہوریت پہ لفظوں کو نیند آئی
کہیں کتابوں کے مقبروں میں ابھی تلک بے صدا معانی سسک رہے ہیں۔

تم گئے، ساتھ اجالوں کا بھی چھوٹا ٹھیرا
روز و شب اپنا مقدر ہی اندھیرا ٹھیرا

یاد کرتے نہیں اتنا تو دلِ خانہ خراب
بھولا بھٹکا کوئی دو روز اگر آ ٹھیرا

کوئی الزام نسیمِ سحری پہ نہ گیا
پھول ہنسنے پہ خطا وار اکیلا ٹھیرا

پتیاں رہ گئیں بو لے اڑی آوارہ صبا
قافلہ موجِ بہاراں کا بس اتنا ٹھیرا

روز نظروں سے گذرتے ہیں ہزاروں چہرے
سامنے دل کے مگر ایک ہی چہرہ ٹھیرا

وقت بھی سعیِ مداوائے الم کر نہ سکا
جب سے تم بچھڑے ہو خود وقت ہے ٹھہرا ٹھہرا

دل ہے وہ موم ملا ہے جسے شمعوں کا گداز
اب کوئی دیکھے نہ دیکھے، یونہی جلنا ٹھہرا

تم نے جو شمع جلائی تھی، نہ بجھنے پائے
اب تو لے دے کے یہی کام ہمارا ٹھہرا

گنگنا لیں گے غزل آج وحید اختر کی
نام لینا ہی جو در پردہ تمھارا ٹھہرا

خوشبو ہے کبھی، گل ہے کبھی، شمع کبھی ہے
وہ آتشِ سیال جو سینے میں بھری ہے

غنچوں کے چٹکنے کا سماں دل میں ابھی ہے
ملنے میں جو اٹھ اٹھ کے نظر ان کی جھکی ہے

معصوم ہے یاد ان کی بھٹک جائے نہ رستہ
خوں گشتہ تمناؤں کی کیوں بھیڑ لگی ہے

ہر رنگ سے ہر رخ سے جسے دل میں اتارا
وہ شکل بھی اب خوابِ فراموش ہوئی ہے

ٹھیری ہے تو اک چہرے پہ ٹھیری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے

○

گلہ نہیں کہ رفیقانِ ناشناس سے ملے
غضب تو یہ ہے کہ جادے بھی ناسپاس ملے

ہمارے کام وہاں پاشکستگی آئی
وہ منزلیں کہ جہاں خضر بدحواس ملے

کوئی نہ دردِ خدا داد کا ملا پارکھ
زمانہ ساز ملے یا خداشناس ملے

ہجومِ نور جو ہوتا تو اور دل بجھتا
چراغ بھی شبِ غم کو اداشناس ملے

کسی کی انجمنِ دل نہ اتنی ویراں ہو
وحید شہرِ نگاراں میں بھی اداس ملے

ڈاکٹر وارث کرمانی

میری ولادت ۱۵ نومبر ۱۹۲۷ء کو اودھ کے مشہور قصبہ دیوا شریف (ضلع بارہ بنکی) میں ہوئی۔ میرے والد شیخ واجد علی ریاست شیخپور کے تعلقدار تھے، فارسی شعر و ادب کے دلدادہ اور شاہان مغلیہ کے بڑے مداح تھے۔ غروب آفتاب کے بعد عام طور سے ان کی محفل جمتی تھی جس میں اکثر قصبہ کے پڑھے لکھے لوگ شریک ہوتے تھے۔

میرے والد کا انتقال ۱۹۳۹ء میں ہو گیا، میری عمر بارہ سال کی تھی۔ نابالغ ہونے کی وجہ سے میری ریاست کورٹ آف وارڈس کے زیر اہتمام آ گئی اور کلکٹر ضلع میرے گارجین مقرر ہوئے۔ اس وقت سید شاہد زیدی مرحوم میرے ضلع میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ کلکٹر ضلع نے مجھے ان کی سپردگی میں دے دیا چنانچہ میری تعلیم و تربیت انھیں کے گھر میں ہوئی۔ زیدی صاحب بڑے زندہ دل خوش پوش اور باغ و بہار طبیعت والے آدمی تھے اور شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، جگر اور سیماب ان کے اکثر مہمان رہتے تھے۔ ان کے بیٹے جواد حیدر اور بیٹی حسن زہرا دونوں کو شعر و ادب سے دلچسپی تھی جس کا اثر میں نے قبول کیا۔

سترہ سال کی عمر میں بعض منچلے احباب کے اصرار پر میں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر لیا اور اپنے وطن دیوا شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اسی زمانے میں میری شادی بھی ہو گئی اور میں اپنے جائداد کے انتظامات، فوجداریوں اور مقدمات، سیر و شکار کے مشاغل، رقص و سرود کی محفلوں اور

دوسری بے اعتدالیوں میں اس طرح غرق ہوا کہ دس سال دنیا وما فیہا کی خبر ہی نہ رہی۔ اس زمانے میں میری شاعری فارسی منظومات اور اردو کی رومانی نظموں اور غزلوں تک محدود رہی اسی دوران میں نے اپنی تعلیم کی طرف دوبارہ توجہ کی اور ۱۹۵۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کر لیا۔ انگریزی ادب کے مطالعہ نے میرے ذہنی افق کو کشادہ کیا اور وہ اعتماد بھی میرے اندر پیدا ہوا جس کے اثر سے ادبی تحریکوں کے وقتی ہنگاموں اور ان کی سہما دینے والی خشونت کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے باطن کی آواز اور اس کی نشاندہی پر چلنا شروع کیا، یہ آواز اب بھی میری رہنمائی کرتی ہے اور مجھے کسی لیبل کا ادیب ہونے سے محفوظ کیے ہے۔ اب یو۔پی میں خاتمہ زمینداری ہو چکا تھا اس لیے مجھے معاشی فکر بھی لاحق تھی چنانچہ میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تیس سال کی عمر میں علی گڑھ آ گیا۔ ۱۹۶۲ء میں فارسی ادب میں دوسرا ایم۔ اے کیا اور ۱۹۶۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں لکچرر مقرر ہوا جہاں اب تک کام کر رہا ہوں۔ ۱۹۶۵ء میں غالب کی فارسی شاعری پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

میرے ابتدائی کلام کا مجموعہ "نارسیدہ" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ میری دوسری کتاب غالب کی فارسی شاعری پر انگریزی زبان میں ہے جسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ غالب صدی کی تقریبات کے سلسلے میں شائع کر رہی ہے اور عنقریب پریس سے آنے والی ہے۔ میرے تنقیدی مضامین پر مشتمل تیسری کتاب زیر ترتیب ہے اور نیا شعری مجموعہ بھی جلد شائع ہونے والا ہے۔ بسر دست میں "بیدل" کی شاعری پر کام کر رہا ہوں۔

سدِّ سکندر

وہ سنہری صبح وہ کرنوں کی ہر جانب پھوار
جب میں اپنے گھر سے اک لمبی مسافت کے لیے
چل پڑا تھا چھوڑ کر ماں باپ کا بے لوث پیار
ساتھ میں کھیلی ہوئی معصوم شکلوں کا خلوص
جن میں آخر کوئی رضیہ کوئی رادھا بن گئی
وہ رفیقوں کی محبت وہ بزرگوں کی نگاہ
راہ میں میرے لیے خضر و مسیحا بن گئی
دھیرے دھیرے میں دیارِ صبح طے کرتا رہا
دوپہر ہوتے ہی ایسے ملک میں داخل ہوا
جس کی صورت خواب میں بھی ذہن میں آئی نہ تھی
محوِ حیرت تھا کہ یہ دنیا میں کب شامل ہوا
اس کے طول و عرض میں آباد ایک مخلوق تھی
جو بظاہر نسلِ انسان سے مشابہ تھی مگر
فطرت میں اس کی چھپی تھیں کچھ جمادی صفات

یعنی وہ انساں شمائل نطق سے محروم تھے
آنکھ ہی ان کی زباں تھی آنکھ ہی ہتھیار تھا
آنکھ سے ہٹ کر نہ تھی کچھ ان میں جنبش یا نمود
آنکھ میں سمٹی ہوئی تھی کائنات ہست و بود
آنکھ ہی سے دشمنی تھی آنکھ ہی سے ہار جیت
آنکھ ہی میں کروٹیں لیتی تھی اک تلوار سی
جس کی نظریں جھک گئیں وقت تصادم مر گیا
اس دیار بے اماں میں اپنے رہنے کی جگہ
دوسرے کے واسطے چپ چاپ خالی کر گیا
عقل حیراں تھی کہ ہے اس قوم کی تہذیب کیا
کس جگہ سر پھوڑتے ہوں گے یہاں کے داد خواہ
کوئی قاضی تھا نہ مفتی تھا نہ کوئی بادشاہ
اک مسلسل ابتری تھی اک منظم انتشار
دل نے گھبرا کر کہا مجھ سے کہ اے شامت زدہ
چپ کھڑا کیا دیکھتا ہے جلد الٹے پاؤں بھاگ
یہ زمیں یاجوج اور ماجوج کی ہے سر بسر
آ گیا ہے تو یہاں سد سکندر پھاند کر
میں یہ سن کر بے تحاشا دوڑتا واپس ہوا
اپنے گھر کی سمت اپنے ارض کنعاں کی طرف
سبزہ زاروں پر جہاں آباد تھے کچے مکاں
جنگلوں سے آتی رہتی ہے جہاں ٹھنڈی ہوا

یوسفِ آوارہ کی خوشبوئے پیراہن لیے
وہ زلیخاؤں کا مسکن وہ عزیزوں کا دیار
وہ فضا جس کی کبھی پھاگن کبھی ساون لیے
رات آتی تھی جو سینے میں تو کتنے پیار سے
دھوتی رہتی تھی گھروں کو چاند کا برتن لیے
دن نکلتا تھا تو کتنی جانفزا لگتی تھی صبح
اک رسولِ خوش خبر کا چہرۂ روشن لیے
اس حسیں وادی میں اب پہنچا جو میں دم توڑتا
وہ ہوا پائی نہ وہ موسم نہ وہ بیل و نہال
میرے گھر والے مرے ماں باپ اور بھائی بہن
گردِ ماہ و سال میں لپٹے ہوئے سر تا قدم
چپ کھڑے تھے سب اسی مخلوق کی صورت لیے

خادمہ

اک دن نزولِ شام ہونے پر صدا کانوں میں یہ آئی
کہ میری سیم تن محبوبۂ رنگیں ادا
پھر مجھ سے ملنے آئی ہے
مجھ کو لگا
دستِ نگاریں سے کسی نے مسکرا کر کھینچ لی
وہ ماورائی خواب کی چادر جسے اب بیشتر اوڑھے رہا کرتا تھا میں
اک بار آخر میں نے خود کو پھر اسی نقشِ حسیں کے سامنے پایا
کہ جس نے آج سے سولہ برس پہلے مجھے امیدوارِ لطفِ بے پایاں کیا تھا
پھر مجھے اپنی عبادت پر بہت افسوس آیا
ہائے یہ عمرِ گریزاں
جس کو ایسی خشک سالی میں گذارا تھا
خبر کیا تھی کہ وہ وعدہ شکن اک دن پھر آئے گی

وہی ابہام دلداری ہے اپنی نگاہوں میں
وہی زلفیں کہ جن سے کارواں در کارواں مشکِ ختن نکلے
وہی آویزۂ خوش رنگ زیبِ گوش تھا اب تک
وہی بے ساختہ ہنسنا مرے وحشی تقاضوں پر
وہی اک سن رسیدہ خادمہ ہمراہ جو پہلے بھی آتی تھی
مجھے اس خادمہ نے دیکھ کر آواز دی

"اے بے مروت"
"میں وہی محبوبۂ رنگیں ادا ہوں تو نے پہچانا نہیں مجھ کو
یہ لڑکی میرا دھوکا جس پہ تجھ کو ہوگیا ہے میری بیٹی ہے
یہ سنتے ہی اک آندھی سی چلی
پھر زندگی مانند سوکھی پتیوں کے دھول میں اڑنے لگی
میں ایک بوڑھے پیڑ کی صورت برہنہ ہوگیا
گھبرا کے میں نے اپنی چادر اوڑھ لی
دستِ نگاریں سے ابھی جس کو کسی نے کھینچ کر نیچے گرایا تھا

درد آشنا نگاہ

وہ درد آشنا نگاہ میری سمت کیا اُٹھی
بیاضِ صبح کی کرن سوادِ شام تک گئی
ستارہ بن کے ذہن میں چراغ سے جلا گیا
بہار ڈھل کے شعر میں لبِ کلام تک گئی
جسے حرام کر دیا تھا محتسب کے قہر نے
تری نظر سے پھر وہی شراب جام تک گئی
جہاں کسی کی بخشش و کرم کا ذکر آ گیا
تو بات رفتہ رفتہ بڑھ کے تیرے نام تک گئی
جسے بھی اوجِ فکر میں تلاشِ کہکشاں ہوئی
نگاہ تیرے قصرِ مرمریں کے بام تک گئی
تری وفا کا سلسلہ گلی گلی نگر نگر
تری عظیم سلطنت دلِ عوام تک گئی
تجھے بشر کی دوستی خلیل و خضر سے ملی
تری حرارتِ عمل اسی مقام تک گئی

تری نگاہِ مہرباں علاجِ دردِ دوستاں
ترے کرم کی داستاں قبولِ عام تک گئی

معلمِ خدانما ، مصنفِ گراں بہا
تری حدیثِ دلکشا حدِ دوام تک گئی

طراوتِ رگِ قلم نے کیا چمن کھلائے ہیں
ذکاوتِ دل و نظر کس اہتمام تک گئی

خیالِ دردِ عاشقاں کے سر جواز تک گیا
نگاہِ حسنِ مہوشاں کے سر پیام تک گئی

ضمانتِ نشاطِ جاں ہیں دوستوں کا ذکر کیا
بشارتِ سکونِ دل ترے غلام تک گئی

تجھے یہ فخر کم نہیں کہ تیرا مدح خواں ہوں میں
صدا یہ ہند سے اٹھی تو روم و شام تک گئی

مرے سخن میں نغمہ خواں چہ لکھنؤ چہ اصفہاں
وہی بہارِ بے خزاں مرے مشام تک گئی

کہیں نگارِ صف بہ صف مری جناب میں رہے
کہیں بہارِ گل بہ کف مرے سلام تک گئی

ہزار مطربِ جواں مرے حضور کف زناں
ہزار روحِ چنگ و دف مرے کلام تک گئی

ستم کشانِ دہر کی دعاؤں کے ہجوم میں
مری دعا بھی تیرے ساتھ چند گام تک گئی

○

کھوئے ہوئے صحرا تک اے بادِ صبا جانا
وہ خاکِ جنوں میری آنکھوں سے لگا جانا

اب تک کوئی چنگاری رہ رہ کے چمکتی ہے
اے قافلۂ فردا یہ راکھ اُڑا جانا

ہم نیند کی چادر میں لپٹے ہوئے چلتے ہیں
اس بھیس میں اب ہم سے ملنا ہو تو آ جانا

تم دور سفر کر کے نزدیک سے لگتے ہو
اب پاس بہت آ کے ہم کو نہ جگا جانا

یا کھل کے برس جانا ہم پیاس کے ماروں پر
یا مزرعۂ ہستی کو اب آگ لگا جانا

اس سمت سے وارث کا چہرہ تو ذرا دیکھو
اے اہلِ جہاں تم نے اس شخص کو کیا جانا

عاشق ہوئے تو عشق میں ہشیار کیوں نہ تھے
ہم ان کے مدح خواں سرِ بازار کیوں نہ تھے

ہاں جب ستم کو عین کرم کہہ رہے تھے لوگ
ہم بھی شریکِ گرمیٔ گفتار کیوں نہ تھے

جب چل رہا تھا وقت پہ جادو نگاہ کا
اک ہم اسیرِ چشمِ فسوں کار کیوں نہ تھے

یہ راز رہ گیا کہ اسیرانِ زلفِ یار
آخر قریبِ آتشِ رخسار کیوں نہ تھے

اب کیا شہیدِ ناز بنے پھر رہے ہیں لوگ
مرنے کا شوق تھا تو سرِ دار کیوں نہ تھے

وارثؔ یہ شاعری سمِ قاتل سے کم نہیں
آپ اس بلائے جاں سے خبردار کیوں نہ تھے

○

قضا جو دے تو ابھی ذرا بدل کے مجھے
ملے یہ جام انھیں انکھڑیوں میں ڈھل کے مجھے

میں اپنے دل کے سمندر سے تشنہ کام آیا
پکارتی رہیں موجیں اچھل اچھل کے مجھے

نگاہ جس کے لیے بے قرار رہتی تھی
سزا ملی ہے اسی روشنی سے جل کے مجھے

کہاں نجوم، کہاں راستے کی گرد حقیر
عجیب زعم ہوا تیرے ساتھ چل کے مجھے

کوئی بھی جب ہدفِ خنجرِ ادا نہ ملا
وہ دشتِ غم سے بلا لے گئے مچل کے مجھے

یہی حقیقتِ عمرِ دراز بن کے رہے
کسی نے خواب دیے تھے جو چند پل کے مجھے

لاکھ ناداں ہیں مگر اتنی سزا بھی نہ ملے
چارہ سازوں کو مری شامِ بلا بھی نہ ملے

حسرت آ گئیں تو ہے ناکامیٔ منزل لیکن
لطف تو جب ہے کہ خود اپنا پتا بھی نہ ملے

کچھ نگاہوں سے غمِ دل کی خبر ملتی ہے
ورنہ ہم وہ ہیں کہ باتوں سے ہوا بھی نہ ملے

اس قدر قحطِ بصیرت بھی نہیں اے واعظ
ہم بتوں کے لیے نکلیں تو خدا بھی نہ ملے

عشق وہ عرصۂ پُرخار ہے ہمدم کہ جہاں
زندگی راس نہ آئے تو قضا بھی نہ ملے

کیا قیامت ہے طبیعت کی روانی وارث
کوئی ڈھونڈے تو نشانِ کفِ پا بھی نہ ملے

اُجڑ کے گھر سے سرِ راہ آ کے بیٹھے ہیں
ہم اپنی ضد میں سبھی کچھ گنوا کے بیٹھے ہیں

کہاں تک اپنی ہی پرچھائیوں سے بھاگیں گے
یہ لوگ جو تری محفل میں آ کے بیٹھے ہیں

عذابِ حشر کا کیا ذکر ہم سے اے واعظ
ہم اس بلا کو یہیں آزما کے بیٹھے ہیں

لپٹ گئے ہم سے بہت روئی گردشِ دوراں
کبھی ہم اس سے جو دامن بچا کے بیٹھے ہیں

نہ جانے کون شکار ادا نگاہ میں ہے
وہ آج بزم میں پھر مسکرا کے بیٹھے ہیں

نگاہِ ناز سے پہلے تو قتلِ عام کیا
اٹھا ہے شور تو اب منہ چھپا کے بیٹھے ہیں

شہریار

نام۔ کنور اخلاق محمد خاں

قلمی نام۔ شہریار۔

۱۶ جون ۱۹۳۶ء کو قصبہ آنولہ ضلع بریلی میں پیدا ہوا۔ بلند شہر کا رہنے والا ہوں۔ ابتدائی تعلیم ہردوئی میں حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء سے علی گڑھ میں ہوں۔ ہائی اسکول سے ایم۔ اے تک تمام امتحانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پاس کیے۔ اسکول کے زمانے میں کھیلوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ شاعری کی ابتدا ۱۹۵۵ء میں کی۔ زمانۂ طالب علمی میں انجمن اردوئے معلیٰ کا سکریٹری اور علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر بھی رہا۔ ۱۹۶۱ء میں امتیاز کے ساتھ اردو میں ایم۔ اے کیا۔ تقریباً دو سال انجمن ترقی اردو (ہند) میں بحیثیت لٹریری اسسٹنٹ کام کیا۔ ۱۹۶۶ء میں شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ شاعری کا پہلا مجموعہ "اسم اعظم" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "ساتواں در" زیر طبع ہے۔

لازوال سکوت

مہیب، لمبے، گھنے پیڑوں کی ہری شاخیں
کبھی کبھی کوئی اشلوک گنگناتی تھیں
کبھی کبھی کسی پتّے کا دل دھڑکتا تھا
کبھی کبھی کوئی کونپل درود پڑھتی تھی
کبھی کبھی کوئی جگنو الکھ جگاتا تھا
کبھی کبھی کوئی طائر ہوا سے لڑتا تھا
کبھی کبھی کوئی پرچھائیں چیخ پڑتی تھی
اور اس کے بعد مری آنکھ کھل گئی میں نے
سرہانے رکھے ہوئے تازہ روزنامے کی
ہر ایک سطر بڑے غور سے پڑھی، لیکن
خبر کہیں بھی کسی ایسے حادثے کی نہ تھی
اور اس کے بعد میں دیوانہ وار ہنسنے لگا
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت

خوابوں کا بھکاری

اپنے معمول کے مطابق ہم
آج بھی روز کی طرح یوں ہی
دن کے ہمراہ بے خیالی میں
وادیٔ شام سے گذرتے ہوئے
رات کی سرحدوں کو چھو لیں گے
نیند کے در کو کھٹکھٹائیں گے
لاکھ روئیں گے گڑگڑائیں گے
کاسۂ چشم میں مگر اک خواب
آج کی رات بھی نہ پائیں گے

نیا امرت

دواؤں کی الماریوں سے سجی اک دوکاں میں
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
اک انساں کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو "زہر" لکھا ہوا ہے
اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے؟

اُفتاد

دیکھتے دیکھتے چپ ہو گئے سب
وہ بھی، جو نیند کی شبنم میں نہا کر
کسی نادیدہ حسیں شکل کے دیدار کی لذت کے بھجن گاتے تھے
وہ بھی جو آنکھوں کے طاقوں میں چراغاں کر کے
چیختے تھے، کبھی روتے تھے، کبھی ہنستے تھے
وہ بھی، جو زخموں کے پھولوں میں لدے
آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے کرتے تھے دعا
کیسی اُفتاد پڑی آخرِ شب
دیکھتے دیکھتے چپ ہو گئے سب

اِسٹل لائف

پھول ، پتیاں ، شاخیں
ہونٹ ، ہاتھ اور آنکھیں
موجِ خوں صدائے دل
ماہتاب اور سورج
منجمد ہیں سب کے سب
وقت کی کماں میں اب
تیر ہی نہیں کوئی

عہدِ حاضر کی دلربا مخلوق

زرد بلبوں کے بازوؤں میں اسیر
سخت، بے جان، لمبی، کالی سڑک
اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشتۂ تقدیر
بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بابیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام
ہوٹلوں، سینما گھروں کے قریب
چیچہاتی ہوئی نئی کاریں
اور پنواڑیوں کی دوکانیں
اور کچھ ٹولیاں نقیبوں کی
"پرس" والوں کے انتظار میں ہیں

ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن
آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر
کتنے دلکش دکھائی دیتے ہیں
بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزو ، غم ، امید ، محرومی
نیند کی گولیاں، گلاب کے پھول
کیلے ، امرود ، سنگترے ، چاول
پینٹ ، گڑیا ، شمیز، جوتے ، دان
ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دلربا مخلوق

○

مشعلِ درد پھر اک بار جلا لی جائے
جشن ہو جائے ذرا دھوم مچا لی جائے

خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گزرا
دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے

جان بھی میری چلی جائے تو کچھ بات نہیں
وار تیرا نہ مگر ایک بھی خالی جائے

جو بھی ملنا ہے ترے در ہی سے ملنا ہے اسے
در ترا چھوڑ کے کیسے یہ سوالی جائے

وصل کی صبح کے ہونے میں ہے کچھ دیر ابھی
داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھا لی جائے

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو!
تا حدِّ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

○

عجیب سانحہ مجھ پر گذر گیا یارو
میں اپنے سایہ سے کل رات ڈر گیا یارو

ہر ایک نقش تمنّا کا ہو گیا دھندلا
ہر ایک زخم مرے دل کا بھر گیا یارو

بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرقِ آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا یارو

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اُسے
سُنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

آندھی کی زد میں شمعِ تمنا جلائی جائے
جس طرح بھی ہو لاج جنوں کی بچائی جائے

بے آب ہو گیا ہے یہ دل کا دشت بھی
اک نہر آنسوؤں کی یہاں بھی بہائی جائے

عاجز ہیں اپنے طالعِ بیدار سے بہت
ہر رات ہم کو کوئی کہانی سنائی جائے

سب کچھ بدل گیا ہے مگر لوگ ہیں بضد
مہتاب ہی میں صورتِ جاناں دکھائی جائے

کچھ ساغروں میں زہر ہے، کچھ میں شراب ہے
یہ مسئلہ ہے تشنگی کس سے بجھائی جائے

شہروں کی سرحدوں پہ ہے صحراؤں کا ہجوم
کیا ماجرا ہے آؤ خبر تو لگائی جائے

نازل ہو جسم و روح پہ جب بے حسی کا قہر
اُس وقت دوستو یہ غزل گنگنائی جائے

یہ اک شجر کہ جس پہ نہ کانٹا نہ پھول ہے
سایہ میں اس کے بیٹھ کے رونا فضول ہے

راتوں سے روشنی کی طلب ہائے سادگی
خوابوں میں اس کی دید کی خو کیسی بھول ہے

ہے ان کے دم قدم ہی سے کچھ آبروئے زیست
دامن میں جن کے دشتِ تمنا کی دھول ہے

سورج کا قہر صرف برہنہ سروں پہ ہے
پوچھو ہوس پرست سے وہ کیوں ملول ہے

آؤ ہوا کے ہاتھ کی تلوار چوم لیں
اب بزدلوں کی فوج سے لڑنا فضول ہے

خوشبو کا جسم سائے کا پیکر نظر تو آئے
دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ منظر نظر تو آئے

اہلِ وفا کو شوقِ شہادت ہے آج بھی
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر نظر تو آئے

پھر چھوڑ دیں گے ہم بھی تعاقب سراب کا
تشنہ لبوں کو کوئی سمندر نظر تو آئے

آنکھیں غبار کی دھند سے آگے کریں سفر
اک نور کی لکیر افق پہ نظر تو آئے

دو چار دن سکون سے ہم بھی گزار لیں
اس دشتِ بے کراں میں کوئی گھر نظر تو آئے

○

آندھیاں آتی تھیں لیکن کبھی ایسا نہ ہوا
خوف کے مارے جدا شاخ سے پتا نہ ہوا

روح نے پیرہنِ جسم بدل بھی ڈالا
یہ الگ بات کسی بزم میں چرچا نہ ہوا

رات کو دن سے ملانے کی ہوس تھی ہم کو
کام اچھا نہ تھا انجام بھی اچھا نہ ہوا

وقت کی ڈور کو تھامے رہے مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا

خوب دنیا ہے کہ سورج سے رقابت تھی جنہیں
ان کو حاصل کسی دیوار کا سایہ نہ ہوا

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

برہنہ جسم بگولوں کا قتل ہوتا رہا
خیال بھی نہیں آیا کسی کو رونے کا

صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا
مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا

بچھڑ کے تجھ سے مجھے یہ گمان ہوتا ہے
کہ میری آنکھیں ہیں پتھر کی جسم سونے کا

ہجوم دیکھتا ہوں جب تو کانپ اٹھتا ہوں
اگرچہ خوف نہیں اب کسی کے کھونے کا

گئے تھے لوگ تو دیوارِ قہقہہ کی طرف
مگر یہ شور مسلسل ہے کیسا رونے کا

مرے وجود پہ نفرت کی گرد جمتی رہی
ملا نہ وقت اسے آنسوؤں سے دھونے کا

بشیر بدر

ہمارا گھرانا۔ میرے دادا سید اصغر علی تک سخت مذہبی رہا۔ دادا موصوف خود فیض آباد کے ایک قصبے کے قاضی تھے۔ والد مرحوم سید محمد نظیر اس فضا کے آدمی نہ تھے میری پیدائش سے قبل ہی انھوں نے اپنا گھر ذرا سی بات پر چھوڑ دیا۔ پھر کبھی واپس نہ آئے میں انھیں کا وارث ہوں۔ آج تک میں نے اپنا آبائی گھر اور زمین نہیں دیکھی میرے سگے چھوٹے بھائی گذشتہ دو سال ہیں ہی چار بار وہاں گئے (کوئی بیس ہزار کا معاملہ تھا) میں نے سادہ کاغذات پر دستخط کر کر دیے۔ وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس مختصر تعارف میں مجھے اور میرے والد مرحوم کو سمجھنے کے لیے یہ تفصیل ناگزیر تھی کہ ؎

ہماری شاخ کا نوخیز پتہ

ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے

میں ۱۵ فروری ۱۹۴۵ء کو بشیر گنج کانپور میں پیدا ہوا حلیم مسلم کانپور اور اسلامیہ کالج اٹاوہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۴ سال کی عمر میں ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن اور کئی مضامین میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ والد صاحب ایک حادثہ میں ذہنی توازن کھو بیٹھے اور چند سال کی بیماری کے بعد انتقال کر گئے اور میں ملازمت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بی۔ اے پرائیویٹ کرنے کے بعد نوکری چھوڑ کر ایم۔ اے کے لیے مسلم یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لیا۔ کمرہ نمبر ۴۹، نیو ہاسٹل (کویت ہاؤس) سلیمان ہال میرے لیے خاصا مبارک ثابت ہوا۔ ایم۔ اے پریویس میں پوری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر سہ روزہ میرٹ اسکالرشپ ملا۔ علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر ہوا اور "غالب نمبر ۱۹۶۹ء" نکالا۔

بت ملک کے مشہور نقادوں اور رسالوں نے کارنامہ قرار دیا۔ انجمن اردوئے معلیٰ کے اہم ترین اجلاس (۱۹۶۸ء) میں سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔

ایم۔اے میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن لانے پر یونیورسٹی میڈل ملا۔

ایم۔اے میں دیگر مضامین میں ٹاپ کرنے والوں کے درمیان بھی فرسٹ رہنے پر "رادھا کرشنن پرائز" ملا۔

یونیورسٹی فیلوشپ مل گیا ہے اور میری تحقیق کا موضوع "جدید غزل" ہے تحقیق کے ساتھ ہی ساتھ یونیورسٹی میں بی۔اے تک کلاسیں بھی پڑھا رہا ہوں۔

مجھے علی گڑھ میں اپنے بزرگوں، دوستوں اور بہنوں کا اتنا پیار ملا ہے کہ کسی دوسری جگہ اسے بیان کیا جائے تو لوگ قصہ کہانی سمجھیں۔ میری غزلوں کا مجموعہ "اکائی" (ایک ہزار) تین ماہ قبل شائع ہوا تھا۔ دوستوں نے خرید کر تحفے میں دوستوں کو دے دیا اب جو چند کاپیاں بچی ہیں انھیں احتیاط سے صرف کرنا ہے تاوقتیکہ دوسرا ایڈیشن شائع نہ ہو جائے۔

اکائی کے انتخاب کا ترجمہ رویندر کمار چودھری نے انگریزی میں کیا ہے اور ان کی یہ کتاب پریس میں ہے۔ گذشتہ ۳ ماہ میں ہندوستان کے بیشتر معیاری مشاعروں مثلاً کشمیر، دلی، گورکھپور یونیورسٹی، پٹنہ، الہ آباد، لکھنؤ (ریڈیو) وغیرہ میں میں نے شرکت کی۔ جہاں گیا اس شعر کے ذریعے میرا تعارف ہوا۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

مگر میں نے تو اور بہت سے شعر کہے ہیں؟

بشیر بدر

○

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے
کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے

سویرے میری ان آنکھوں نے دیکھا
خدا چاروں طرف بکھرا ہوا ہے

اندھیری رات کا تنہا مسافر
مری پلکوں پہ اب سہما کھڑا ہے

سمیٹو اور سینے میں چھپا لو
یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے

ہماری شاخ کا نوخیز پتّہ
ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے

مجھے ان نیلی آنکھوں نے بتایا
تمھارا نام پانی پر لکھا ہے

○

وہ سادگی نہ کرے کچھ بھی تو ادا ہی لگے
وہ بھول پن ہے کہ بے باکی بھی حیا ہی لگے

یہ زعفرانی پلوور، اسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں، خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

حسیں تو اور ہیں، لیکن کوئی کہاں تجھ سا
جو دل جلائے بہت، پھر بھی دلربا ہی لگے

ہزاروں بھیس میں پھرتے ہیں رام اور رحیم
کوئی ضروری نہیں ہے بھلا، بھلا ہی لگے

○

نظر سے گفتگو۔ خاموش لب۔ تمہاری طرح
غزل نے سیکھے ہیں انداز سب تمہاری طرح

جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادرِ آب
دکھائی دور سے دیتے ہیں سب تمہاری طرح

بلا رہا ہے زمانہ مگر ترستا ہوں
کوئی پکارے مجھے بے سبب تمہاری طرح

بس ایک تم ہو جو بدلے ہوئے سے لگے ورنہ
تمہارے شہر میں ملتے ہیں سب تمہاری طرح

سُناتے ہیں مجھے خوابوں کی داستاں اکثر
کہانیوں کے پُراسرار لب تمہاری طرح

○

سو خلوص باتوں میں، سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

یوں کسی کی آنکھوں میں صبح تک ابھی تھے ہم
جس طرح رہے شبنم پھول کے پیالوں میں

رات تیری یادوں نے دل کو اس طرح چھیڑا
جیسے کوئی چٹکی لے نرم نرم گالوں میں

میری آنکھ کے تارے اب نہ دیکھ پاؤ گے
رات کے مسافر تھے کھو گئے اُجالوں میں

جیسے آدھی شب کے بعد چاند نیند میں چونکے
وہ گلاب کی جنبش اُن سیاہ بالوں میں

○

مری نظر میں خاک، تیرے آئینے پہ گرد ہے
یہ چاند کتنا زرد ہے، یہ رات کتنی سرد ہے

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سبھی مشین ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن نہ کوئی مرد ہے

خدا کی نظموں کی کتاب ساری کائنات ہے
غزل کے شعر کی طرح ہر ایک فرد، فرد ہے

حیات آج بھی کنیز ہے حضورِ جبر میں
جو زندگی کو جیت لے وہ زندگی کا مرد ہے

اسے تبرکِ حیات کہہ کے پلکوں پہ رکھوں
اگر مجھے یقین ہو یہ راستے کی گرد ہے

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
انھیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا کتنا سرد ہے

○

روشنی کے مقدر میں نیندیں کہاں، چاندنی، طاق پر وہ سجائیں کہیں
ہم چراغِ وفا۔ جلتا ہے رات بھر آسماں تا زمیں وہ جلائیں کہیں

دو بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے ملیں، یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

شہر میں مثلِ مینارِ عظمت ہمیں آسماں کی طرف لے چلی ہیں مگر
جی میں ہے "سبز پیغمبروں" کی طرح سینۂ سنگ سے سر اٹھائیں کہیں

برف سی اجلی پوشاک پہنے ہوئے، پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہیں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں، آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

کوئی کتبہ نہیں ہیں سرِ راہ ہم جس پہ اقوالِ زریں بدلتے رہو
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھ لو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں

ان کہے شعر ہیں وادیٔ ذہن میں مختلف رنگ کے جھلملاتے دیے
دستِ الفاظ محفوظ کر لے انھیں، چل رہی ہے ہوا بجھ نہ جائیں کہیں

جب سحر چُپ ہو، ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو

ہم حقیقت ہیں نظر آتے ہیں
داستانوں میں چھپا لو ہم کو

دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز
صبح سے پہلے اُٹھا لو ہم کو

دور ہو جائیں گے سورج کی طرح
ہم نہ کہتے تھے، اچھالو ہم کو

ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت
اپنے سینے سے لگا لو ہم کو

وقت کے ہونٹ ہمیں چھو لیں گے
ان کہے بول ہیں گا لو ہم کو

○

خفتہ شجر لرز اُٹھے جیسے کہ ڈر گئے
کچھ چاندنی کے پھول زمیں پر بکھر گئے

وہ خشک ہونٹ ریت سے نم مانگنے لگے
جس کی تلاش میں کئی دریا گذر گئے

میرے لبوں پہ چاند کی قاشیں لرز گئیں
آنکھوں پہ جیسے رات کے گیسو بکھر گئے

ساحل پہ رک گئے تھے ذرا دیر کے لیے
آنکھوں سے دل میں کتنے سمندر اتر گئے

پایا جو مسکراتے ہوئے کہہ اٹھی بہار
جو زخم پچھلے سال لگائے تھے بھر گئے

جن پہ لکھی ہوئی تھی محبت کی داستاں
وہ چاک چاک پُرزے ہوا میں بکھر گئے

دہکتی دھوپ، سمندر ہے۔ یہ جزیرے ہیں
گھنے درخت جو سڑکوں پہ سایہ کرتے ہیں

عجیب شہر ہے یہ، اس کے آسمان پہ بھی
لہو میں ڈوبے ہوئے سرخ سرخ کپڑے ہیں

وہ کوئی اور تھا شب خون مارنے والا
ہمیں نہ مارو کہ ہم بے ضرر فرشتے ہیں

یہ سخت پتھروں کا دشت ہے یہاں سے چلیں
ہمارے پاس تو گیلی زمیں کے پودے ہیں

عرق نچوڑنے والی مشین، پیاسی ہے
ابھی ہمارے بدن سبز کچے کچے ہیں

عظیم دشمنو! چاقو چلاؤ موقع ہے
ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

کہانیوں کی کئی باتیں سچ ہوئیں جیسے
سنہرے شہر سمندر میں بہتے رہتے ہیں

انتخاب

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

دل کی بستی بھی شہر دلّی ہے — جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

کئی اجنبی تری راہ میں، مرے پاس سے یوں گذر گئے
جنھیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی، ترا نام لے کے پکار لوں

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے — انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

سجھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے — کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا — کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا — ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنائے گا، بہتا ہوا پانی ہے

شمیم حنفی

تاریخ پیدائش: ۱۷ رمئی ۱۹۳۹ء - وطن: سلطان پور (یو-پی)

میرے والد سلطان پور ہی میں وکالت کرتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۸ء میں بی۔اے، ۱۹۶۰ء میں ایم۔اے (تاریخ) اور ۱۹۶۲ء میں ایم۔اے (اردو) کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اسی سال ریسرچ کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا اسکالرشپ مل گیا۔ محمد حسین آزاد کے ادبی کارناموں پر مقالہ زیر تکمیل ہی تھا کہ اندور یونیورسٹی کے ایک کالج میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ وہاں اندور یونیورسٹی کے اردو، فارسی و عربی بورڈ کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ اندور ہی کے زمانۂ قیام میں ۱۹۶۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ جولائی ۱۹۶۹ء سے علی گڑھ میں مقیم ہوں اور شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی میں یو۔جی۔سی کے سینیئر ریسرچ فیلو کی حیثیت سے ڈی۔لٹ کے لیے "بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی فلسفیانہ بنیادوں" کے موضوع پر کام کر رہا ہوں۔

شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اب تک چند انگریزی کتابوں کے اردو تراجم، چند اردو کتابوں کے ترجمے ہندی میں اور بچوں کے لیے دو کتابیں اردو میں اور ایک ہندی میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک کتاب حکومت اتر پردیش کے محکمۂ تعلیم نے اپنی توسیعی اسکیم میں بھی شامل کی تھی۔ ریڈیو اور بچوں کے لیے "ڈراموں، فیچر اور کہانیوں کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی مضامین ہند و پاک کے بیشتر اہم رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہندی میں اردو شاعری کی ایک تاریخ مرتب کرنا شروع کیا تھا، اس سلسلے میں کئی مضامین اور اردو شعر و ادب سے متعلق چند اور تعارفی و تشریحی مضامین متعدد ہندی اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

○

سمجھ سکے نہ جسے کوئی بھی سوال ایسا
بُنا ہے سانس کے دھاگوں نے ایک جال ایسا

کبھی دماغ تھا مجھ کو بھی خود پرستی کا
پلٹ کے ذہن میں آیا نہ پھر خیال ایسا

میں آسماں تو نہ تھا جس میں چاند چھپ جاتے
ہوا نہ ہوگا کسی کا کبھی زوال ایسا

تمام عمر نئے لفظ کی تلاش رہی
کتابِ درد کا مضموں تھا پائمال ایسا

کنارِ آب نہ پہنچے گی جان کی کشتی
بہت دنوں سے ہے پانی میں اشتعال ایسا

○

کیوں دل میں چھپی بات چلی آئی زباں پر
لفظوں کا ستم ٹوٹ پڑا چپ کے مکاں پر

کافور کے نشّے سے بدن ٹوٹ رہے ہیں
اک کاسۂ زہراب تھا ہر سنگِ نشاں پر

شیشوں میں چھپے سنگ بہر رنگ عجب تھے
لوگوں کو ہنسی آ گئی احساسِ زیاں پر

عرفان کے ماتھے پہ کلاہِ شفقی تھی
چھائی تھی اندھیروں کی گھٹا برقِ تپاں پر

ہر سمت وہی مرگِ تبسم کے نظارے
لاشوں کا گماں ہونے لگا خوش نگہاں پر

ادراک کی سرحد سے نکل جانا بھی مشکل
کس طرح گذاریں گے گر بسترِ جاں پر

آئینہ سامانِ حیرت اور چہرہ اجنبی
دھیرے دھیرے ہو گیا سارا سراپا اجنبی

کیا ہوا دل کو کہ تیرا نام بھی لیتا نہیں
کیوں نظر آتی ہے اب تیری تمنا اجنبی

گھر میں بیٹھوں تو در و دیوار بیگانے لگیں
اور باہر جاؤں تو لگتی ہے دنیا اجنبی

مضمحل کاندھوں پہ صدیوں کی تھکن کا بوجھ ہے
کون سی منزل پہ ہے تیرا ٹھکانا اجنبی

یہ پرایا شہر ہے اوروں کی باتوں پہ نہ جا
اپنی آنکھوں پہ نہ کر اتنا بھروسا اجنبی

اب کبھی اس شام کے منظر نہ دیکھے جائیں گے
رات اس بستی پہ ایسا قہر ٹوٹا اجنبی

وہ ایک شور سا زنداں میں رات بھر کیا تھا
مجھے خود اپنے بدن میں کسی کا ڈر کیا تھا

کوئی تمیز نہ کی خون کی شرارت نے
اک ابر و باد کا طوفاں تھا دشت و در کیا تھا

زمیں پہ کچھ تو ملا چند الجھنیں ہی سہی
کوئی نہ جان سکا آسمان پہ کیا تھا

مرے زوال کا ہر رنگ تجھ میں شامل ہے
تو آج تک مری حالت سے بے خبر کیا تھا

اب ایسی فصل میں شاخ و ثمر پہ بار نہ بن
یہ بھول جا کہ پسِ سایۂ شجر کیا تھا

چٹختی گرتی ہوئی چھت اجاڑ دروازے
اک ایسے گھر کے سوا حاصلِ سفر کیا تھا

بند کرے کھڑکیاں یوں رات کو باہر نہ دیکھ
ڈوبتی آنکھوں سے اپنے شہر کا منظر نہ دیکھ

میں نے پتھر سہہ لیے لیکن صدا قاتل ہوئی
خود کو لفظوں سے بچا گرتے ہوئے پتھر نہ دیکھ

ایسا ہنگامہ کہ آوازِ نفس بھی کھو گئی
زندگی کی بات کر یہ عرصۂ محشر نہ دیکھ

تو نے جو پرچھائیاں چھوڑیں وہ صحرا بن گئیں
اے نگارِ وقت اب پیچھے کبھی مڑ کر نہ دیکھ

کیا پتہ زنجیر میں ڈھل جائے چادر کی شکن
یہ سفر کا وقت ہے اب جانب بستر نہ دیکھ

خاک و خوں میراث تیری خاک و خوں تیرا نصیب
اس زیاں خانے میں اپنے پاؤں کا چکر نہ دیکھ

○

نیلے پیلے سیاہ سُرخ سفید، سب تھے شامل اسی تماشے میں
یورش رنگ نے ذلیل کیا، آنکھ بھی گم ہوئی تماشے میں

کوئی بھی ان میں چارہ ساز نہ تھا، سبھی بیمارِ جستجو نکلے
تم ہی سوچو کہ بیدلی کس سے، راستہ پوچھتی تماشے میں

جسم کا سونا، روپ کی چاندی، کون سا دھن کسی کے پاس رہا
ایک میرا تمھارا قصّہ کیا، ساری دنیا لُٹی تماشے میں

چاند تھا ساحلِ نفس کے قریب، ایک دن میرے دل میں ڈوب گیا
صبح کا راز رائگاں ٹھہرا، شام بھی کھل گئی تماشے میں

کبھی دریا کے ساتھ ساتھ بڑھے، کہیں بھٹکے کہیں نظر نہ اٹھی
ایک عمرِ رواں تھی جی کا زیاں، سو گذرتی رہی تماشے میں

ایک شعلہ ہوس کا بس میں نہ تھا، آپ اپنے سے ہاتھ دھو بیٹھے
خاک آغاز خاک ہی انجام، آگ ایسی لگی تماشے میں

○

غروب ہوتی ہوئی شامِ شادمانی کے بعد
کہاں رُکے گی یہ جوئے نفس روانی کے بعد

وہی اندھیرا جو ہر لفظ کی حکایت ہے
سجھائی کچھ نہیں دیتا ہمیں معانی کے بعد

کسی سے کوئی شکایت ہوئی نہ پھر دل کو
سکون ایسا ملا خود سے بدگمانی کے بعد

خلا کی دھجیاں بکھری ہوئی ہیں چاروں طرف
بہت اداس ہوئے لوگ کامرانی کے بعد

متاعِ خاک ہوئے جب تو ڈھونڈتے ہیں سبھی
ہمارا ذکر بھی آیا مگر کہانی کے بعد

گھنے اندھیروں میں بھٹکیں گی عمر بھر آنکھیں
تماشا بن گئے خوابوں کی پاسبانی کے بعد

گرد میں الجھے ہوئے پتوں کی آوازیں یونہی سنتے رہو سنتے رہو
رات کی پہلی گھڑی ہے قصۂ آوارگی سنتے رہو سنتے رہو

تم شکستِ خواب کے صحرا سے جب نکلے تو سورج درد کے زنداں میں تھا
اُن فصیلوں سے رہا کیونکر ہوئی تھی روشنی سنتے رہو سنتے رہو

سوچ میں ڈوبے ہوئے دریا کے سینے سے کبھی شام یوں لپٹی ہوئی
کس طرح ویرانیوں میں گونجتی ہے خامشی سنتے رہو سنتے رہو

ہم اکیلے تھے مگر دل کو یہی ضد تھی کسی کو ساتھ بھی ہونے نہ دیں
یاس کا گہرا گھنا جنگل یہ آشفتہ سری سنتے رہو سنتے رہو

ایک دن آخر سبھی کھو جائیں گے یہ شہر بے نام و نشاں ہو جائے گا
تلخ ہے یہ داستاں لیکن ادھوری ہے ابھی سنتے رہو سنتے رہو

○

ایک بے نام و نشاں روح کا پیکر ہوں میں
اپنی آنکھوں سے اُلجھتا ہوا منظر ہوں میں

کون بہتے ہوئے پانی کو صدا دیتا ہے
کون دریا سے یہ کہتا ہے سمندر ہوں میں

مجھ سے دم بھر کی رفاقت بھی ہوا کو نہ ملی
اپنی پرچھائیں سے لپٹا ہوا پتھر ہوں میں

یہی اُجڑی ہوئی بستی ہے ٹھکانہ میرا
ڈھونڈنے والے اسی خاک کے اندر ہوں میں

تھم نہ جائیں گی یہ خون کی پیاسی راہیں
زندگی مجھ میں سمٹ آ کہ ترا گھر ہوں میں

○

شام تا شام یونہی خاک بسر جانا ہے
منزلیں گم ہیں دھندلکوں میں مگر جانا ہے

دل کی قسمت وہی دن رات کی آشفتہ سری
اور آنکھوں کو یہی ضد ہے کہ گھر جانا ہے

سب کی آنکھوں میں کسی ہادیٔ موعود کے خواب
کون بتلائے کہ اس وقت کدھر جانا ہے

کن فصیلوں میں گرفتار ہے عرفانِ وجود
کیا یونہی مجھ کو اندھیروں میں بکھر جانا ہے

مٹ چکا نقشِ وفا ڈوب چکی نبضِ سفر
اب فقط ایک سمندر میں اتر جانا ہے

○

سوچ میں ڈوبے ہوئے چہرے عجب لگتے تھے
آپ ہی اپنی اداسی کا سبب لگتے تھے

رنگ دکھلائی دیے جسم کے زنداں میں اسیر
آئنے روح کے تصویرِ طلب لگتے تھے

جانے آنکھوں کی شرارت تھی کہ سمتوں کا زوال
ایک ہی جیسے مجھے راہ میں سب لگتے تھے

دھوپ کی دھند میں لپٹے ہوئے منظر سارے
کتنے روشن تھے مگر صورتِ شب لگتے تھے

کیوں نظر آئے مجھے شورِ تمنا سے نڈھال
وہی لمحے جو تجھے مہر بہ لب لگتے تھے

مجھے چراغ تو کیسا سماں دکھائی دیا
رگِ گلو سے اُبلتا دھواں دکھائی دیا

جنم جنم کی رفاقت وہیں پہ ختم ہوئی
خلا میں روح کو جب اک مکاں دکھائی دیا

سبھی نے ڈھونڈ لی اک روز پتھروں میں پناہ
بس ایک سلسلۂ غم رواں دکھائی دیا

کبھی جو منھ نہ لگاتا تھا چڑھتے سورج کو
اجڑ گیا تو بہت مہرباں دکھائی دیا

جو ساتھ تھے اک دوسرے پہ ٹوٹ پڑے
بساطِ ریگ پہ جب اک کنواں دکھائی دیا

مجھے خود اپنے سفر کی شکست کا منظر
اداس ہو کے بہت شادماں دکھائی دیا

کچھ ایسی آگ لگائی ہے شعلۂ جاں نے
کہ اپنا سایہ بھی آتش فشاں دکھائی دیا

ہوا کی طرح خوشی بھی ادھر سے گزری تھی
مرا وجود مگر بے نشاں دکھائی دیا

میں تجھ میں کھو کے بھی اک نقش لازوال رہا
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو کہاں دکھائی دیا

ساجدہ زیدی

بھٹکی رُوح

بہت عرصہ ہوا،
اک نیم جاں مدھم سی چنگاری سے ہم نے بھی
دہکتا جگمگاتا، اک عجب شعلہ جلایا تھا
کہ جس کی آنچ سے پتھر پگھل جاتے تھے دل بن کر
کہ جس کی لو جلا دیتی تھی راتوں کا سیہ دامن
کہ جس کی گرم آتش کا سمندر،
سردہ یخ بستہ فضاؤں میں بھی طوفاں خیز رہتا تھا

وہ شعلہ جل بجھا کب کا.....
اب اس کی راکھ بھی شاید.....
کہیں راہوں کے ذرّوں میں بکھر کر کھو گئی ہو گی
لیکن .....
وہ چنگاری سنا ہے اب بھی
لمحوں کے کھنڈر میں
گاہے گاہے جھلملا اٹھتی ہے راتوں کی سیاہی میں
بھٹکتی روح ہو جیسے کوئی صدیوں سے آوارہ

ساجدہ زیدی

ایک نظم

تھکن، بیزاریاں، گہری اداسی، ٹوٹتے لمحے،
دلِ وحشی کے زنداں خانے میں سر پھوڑتی سانسیں
چٹخنے دل کے آئینے
سلگتی فکر کی بھٹی
دہکتا ذہن کا آتش کدہ
گرتے لرزتے خواب کے پیکر
ہر اک ساعت کے دامن سے الجھتی ان کی تعبیریں
کھلی آنکھوں کی گہرائی میں ساکت جذبہ و احساس کے دریا
تبسم زیرِ لب معنی کی تلخی سے چٹخنا ٹوٹتا ساغر
ہر اک شریان میں ہر قطرۂ خوں
گردشِ زہراب کا گہوارۂ جنباں
اگر بس نام اسی کا زیست ہے یارو
تو آؤ دل کی گرمی سے جلائیں اور بھی کچھ ذہن کا لاوا
اور اس آتشکدہ میں چند پتھر اور پگھلائیں
کہ یہ ساری فضا کافی نہیں ہے وحشتِ دل کو
کہ یہ سارا جہنم،
اک نظر کی موج سے غرقاب ہو جانے کو ہے
بے معنویت کے سمندر میں

زاھدہ زیدی

تخریب

ہم کہ اک اجنبی موڑ پر
تشنہ لب، پا برہنہ، بڑی دیر سے
جانے کس چیز کے منتظر ہیں

ہم نے چشمِ جنوں کی شرابِ کہن
ایک صحرائے بے برگ دبر میں لنڈھا دی
ہم نے لمحاتِ شب کی متاعِ گراں
فکرِ عکسِ نگارِ سحر میں لٹا دی
ہم نے سیماب پا شعلہ رُخ زندگی
ایک موہوم عزمِ سفر میں بتا دی

ہم نے ریشم کے کیڑے کی مانند
اپنے برہنہ بدن کے لیے
نرم و رنگین خوابوں کا خلعت بُنا

اور پھر رفتہ رفتہ،
اسی تنگ و تاریک سے ریشمی خول میں
شوق کی سانس گھٹنے لگی
آرزو کا لہو جم گیا
اور ریشم کے کیڑے کی مانند، ہم
اپنے واماندہ احساس کی قبر میں سو گئے

اور اب ہم کسی اجنبی موڑ پہ
ملگجے، زرد خوابوں کے دامن میں لپٹے ہوئے
تشنہ لب، پابرہنہ، بڑی دیر سے
جانے کس چیز کے منتظر ہیں

بند کمرہ

دیکھو، پردوں کو اچھی طرح کھینچ دو
اور سب کھڑکیاں بھی بند کر دو
اور اس بند کمرے سے باہر نکلو
جس میں بوسیدہ صوفوں پہ اک موٹا کپڑا چڑھا کر
تم نے اس کو اس انداز سے رکھ دیا ہے
کہ اب دائیں کونے میں
اکھڑی سفیدی پہ سیلن کے دھبے
کم و بیش نظروں سے پوشیدہ ہیں
اور بائیں طرف
ٹوٹے ڈبوں،
پرانے خطوں،
زنگ آلود ٹوٹی پلیٹوں
اور بوسیدہ پنجروں کے اک ڈھیر کو
تم نے اک لمبی چوڑی سی چادر سے
اچھی طرح ڈھک دیا ہے

اور اب باقی کمرہ
بڑا صاف ستھرا نظر آ رہا ہے
دیکھو ٹوٹی ہوئی کارنس کو ابھی
ایک شوخ کپڑے سے ڈھک کر
اس پہ وہ زرد شمعیں جلا دو
کہ جن کی سسکتی ہوئی روشنی میں
تمہارے خد و خال معلوم ہوتے ہیں موزوں
اور کونے میں رکھے ہوئے
چھوٹے ریکارڈ پلیئر پہ وہ ڈسک رکھ دو
کہ جس میں پرانی سی اک لے میں
بس چند لفظوں کی تکرار ہے

دیکھو اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو
کبھی بھول کر بھی
برابر کے کمرے میں ہرگز نہ جاؤ
کیونکہ وہ سالہا سال سے بند ہے
یہ بھی ممکن ہے
زہریلے کیڑے مکوڑے وہاں پل رہے ہوں
یہ بھی ممکن ہے
اب تک وہ بھوتوں کا گھر بن چکا ہو

دیکھو اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو
کیونکہ یہ ممکن ہے اب تک
وہ زخمی برہنہ بدن،
باغ کے ایک کونے میں دم توڑتے ہوں
ہاں اگر ہوسکے تو کسی سے کہو
ان کے خوں گشتہ جسموں پہ
زرتار لفظوں کی پوشاک ڈھک کر
ان کو باہر پڑی کرسیوں پر بٹھا دے
تاکہ اس راہ سے کوئی گزرے
تو کہہ دے کہ "سب ٹھیک ہے

.. ..

.. ..

تم مگر پھر بھی سب کھڑکیاں بند رکھو
اور پردوں کو اچھی طرح کھینچ دو
اور اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو
دیکھو اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو
.. ..

امین اشرف

○

ترے جمال سے عمرِ رواں کی برنائی
ترے خیال سے قلب و نظر کی گیرائی

ز فرق تا بہ قدم یہ جمال و زیبائی
تمام حسنِ مجسم، تمام رعنائی

یہ احتیاطِ محبت کہ روبرو تیرے
اٹھا سکا نہ نظر بھی ترا تمنائی

جہاں یہ رازِ محبت تو آشکار ہوا
انھیں سے کہہ نہ سکا حال ان کا شیدائی

غمِ فراق و غمِ آرزوئے یار سے ہے
وہ اضطراب کہ ہے جانِ صد شکیبائی

امین خانماں ویراں کو پوچھتے کیا ہو
نہ جانے کون سے عالم میں ہے وہ سودائی

امین اشرف

○

دل کا منشا ہے کہ پامالِ تمنا ہو جائے
یہ تو دنیا ہے نہ جانے یہاں پھر کیا ہو جائے

اک تبسم کو سمجھ بیٹھے تھے تعبیرِ حیات
دفعتاً جیسے کسی خواب کا دھوکا ہو جائے

شعلہ خوئی بھی رہے نرمیٔ احساس کے ساتھ
دل کبھی صورتِ شبنم، کبھی خارا ہو جائے

ڈوبتی جاتی ہے آوازِ شبِ تار کی لے
جیسے نغمہ کوئی گم کردۂ صحرا ہو جائے

اپنے شعلوں میں تو جل اٹھتے ہیں جلنے والے
اک نظر ایسی کہ ہر سمت اجالا ہو جائے

خارِ منزل کو گلِ تر نہیں کہتے بنتا
یہ الگ بات کہ سیرابِ نظارا ہو جائے

جانے کیا ہے ترے چشمِ میں کہ جو دیکھے اسے
رفتہ رفتہ ترا مشتاقِ سراپا ہو جائے

دل خدا جانے تری یاد سے غافل کیوں ہے
جیسے کچھ حوصلۂ ترکِ تمنا ہو جائے

بے غرض بھی نہیں ایسا دلِ شیدا اپنا
کیا خبر کب نظرِ شاہدِ رعنا ہو جائے

امین اشرف

○

اے دوست عرضِ حال کسی نے سنا کہاں
پوچھے مگر کوئی تو لبِ مدعا کہاں

کہتا رہا زمانہ مرے غم کی داستاں
میں سوچتا رہا دلِ درد آشنا کہاں

وہ دردِ جستجوئے گل و نغمہ تھی جسے
خود اپنے ریگ زار میں گم ہو گیا کہاں

طے کر رہا ہوں خواب و حقیقت کے فاصلے
مانا کہ میں کہاں، تری آوازِ پا کہاں

اس درجہ بے رخی پہ پشیماں نہ ہو کوئی
خود مجھ کو احترامِ شعورِ وفا کہاں

عالم تمام پیرہن تار تار ہے
محشر سکوتِ نیم شبی کا اٹھا کہاں

ذکاء الدین شایاں

○

ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا پوچھتی رہی
اس جانِ آرزو کو وفا پوچھتی رہی

اک ایک غم کو اہلِ تمنا چھپا گئے
اک ایک غم کو چشمِ حیا پوچھتی رہی

موجِ بہار آج چمن میں ہے کیوں اداس
اس زلفِ مشکبو کی ہوا پوچھتی رہی

اک مژدۂ حیات لیے، وہ ادائے ناز
آوارگانِ غم کا پتا پوچھتی رہی

خود اپنے دل کا راز، خود اپنے ہی دل کی بات
غنچوں کو گدگدا کے صبا پوچھتی رہی

ذکاء الدین شایاں

○

ابھرتا چاند، سیہ رات کے پروں میں تھا
کوئی تو چہرہ، مرے درد کے گھروں میں تھا

وہ عکسِ چہرہ، جو خوابوں میں ہو گیا تحلیل
کبھی اِن آنکھوں کے سمٹے ہوئے دروں میں تھا

خنک ہواؤں کے زانو پہ سو چکے ہیں وہ
تری وفاؤں کا کچھ درد جن سروں میں تھا

گذشتہ رات کی آندھی بھی آ کے دیکھ گئی
اٹل سکوت غموں کے سمندروں میں تھا

یہ دن کا داغ جو راتوں میں منھ چھپاتا ہے
کبھی، یہی تو سحر کے پیمبروں میں تھا

امیر عارفی

روشنی اور صحرا

عجیب ہے یہ شہر روشنی کا
جدھر بھی دیکھو
رواں ہے سیلاب زندگی کا
ہماری آنکھوں سے جھانکتے ہیں ہزار صحرا
جہاں نہ پانی
نہ کوئی سایہ
نہ کوئی ٹھنڈک
جہاں پہ تنہائی اور اداسی کی بستیاں ہیں
جدھر بھی دیکھو
وہاں تمناؤں، آرزوؤں کے ریگ زاروں کا سلسلہ ہے
ہر ایک صحرا میں
وحشتوں کی مہیب آندھی امنڈ رہی ہے
عجیب ہے یہ شہر روشنی کا
ہماری آنکھوں میں بس گئے ہیں ہزار صحرا
ہر ایک صحرا سے جھانکتے ہیں
کئی خرابے

ہر اک خرابے کی روح پیاسی
زبان پیاسی، نگاہ پیاسی
ہے کس میں ہمت جو اس خرابے میں جھانک جائے
مگر خرابے میں
کون آئے
ریگ زاروں میں
کون جھیلے
ہماری آنکھوں میں
کون جھانکے
ہمیشہ بہتا رہے گا سیلاب زندگی
عجب ہے یہ شہر روشنی کا
ہماری آنکھوں سے جھانکتے ہیں ہزار صحرا!

احتشام اختر

○

تیرے ہی بدن کے لیے تلوار بھی ہوگی
یہ ٹھنڈی ہوا باعث آزار بھی ہوگی

گونجی تھی جو آواز مری دشت میں اک دن
معلوم کسے تھا کہ گرفتار بھی ہوگی

بستی سے بہت دور بیاباں میں کبھی موت
یاروں کے لیے سرخئ اخبار بھی ہوگی

بوتا ہوں اس امید پہ میں دل میں محبت
بنجر تو ہے دھرتی کبھی گلزار بھی ہوگی

جس چیز کو ہیروں کی طرح دیکھ رہے ہو
گر جائے گی ہاتھوں سے تو جھنکار بھی ہوگی

سوچا ہی نہ تھا اس دل نافہم نے اختر
پھینکے گا اگر تیر تو یلغار بھی ہوگی

احتشام اختر

○

اگرچہ سپاہی ہوں ہارا ہوا
میں خوش ہوں کہ میں سب سے تنہا لڑا

نئے زخم کی لذتوں کے لیے
کرائے کا گھر میں بدلتا رہا

کئی سال تک کوئی گمنام سے
محبت کے خط مجھ کو لکھتا رہا

نئے شہر کی اجنبی راہ پر
نئے خواب کا سلسلہ مل گیا

نہ منزل کا غم تھا نہ مرنے کا ڈر
ہوا سے لپٹ کر میں اڑتا رہا

شاہد ماہلی

○

چاند ستاروں کے البم میں سورج کی تصویر ملی
تاریکی کے جسم سے لپٹی کرنوں کی زنجیر ملی
جلتے بجھتے شیش محل میں ناچ رہی تھی سبز پری
صبح ہوئی پائل سے لپٹی کرنوں کی زنجیر ملی
پھول کی نازک پیشانی پہ روشن تھے کچھ تاج محل
سرخ گلابی محرابوں پہ سبز لکھی تحریر ملی
ہنس کر ٹال دیا تو اس کے فقرے رنگ برنگے تھے
سوچ کے ساگر میں ڈوبا تو بات بڑی گمبھیر ملی
رات کی پریاں گہرے جل میں ڈوب کے جب اوپر آئیں
دور چمکتی ریت کے سر پہ لٹکی اک شمشیر ملی
زہریلی راتوں کا جادو جذب ہوا انگاروں میں
صدیوں پہلے دیپ جلایا آج اس کی تنویر ملی
سورج کی کرنیں پلکوں پہ ڈوب گئیں تو آنکھوں کو
جھکی ہوئی نظروں کا چاند اور تاروں کی جاگیر ملی

شہاب عراقی

○

سر پہ لٹک رہا ہوں میں شمشیر کی طرح
بکھرا ہوا ہوں فرش پہ زنجیر کی طرح

اس شہر میں دلوں کے دریچے نہ کھولیے
ہر شخص دوڑتا ہے یہاں تیر کی طرح

وہ مجھ کو گھورتا ہے مصوّر کی آنکھ سے
آتا ہوں جس کے سامنے تصویر کی طرح

تنہائیوں کی آنچ سے آنکھیں پگھل گئیں
دل بجھ گیا جلی ہوئی تحریر کی طرح

تہذیب عہدِ وسطیٰ کے مانند ہے دماغ
اور زندگی گھسی ہوئی تقریر کی طرح

مرزا خلیل

○

مجھ جیسا دوسرا کوئی چہرا نہیں ملا
اچھا ہوا کہ دشت میں دریا نہیں ملا

لمحوں کی ڈور کو تو کسی دم میں توڑ دوں
آگے جو ساتھ دے کوئی ایسا نہیں ملا

گذرا ہوں غم کی راہوں سے میں بھی یہ اور بات
لوگوں کو میرا نقشِ کفِ پا نہیں ملا

چاہا بہت بچوں میں اندھیرے کی دھوپ
سورج جو ٹھیک سر پہ تھا سایہ نہیں ملا

لہریں فصیل توڑ کے ساحل سے جا لگیں
کہتے ہیں لوگ ان کو کنارا نہیں ملا

ذوقی کریمی

○

تھم گئے اشک مگر آہ ابھی باقی ہے
دل میں چنگاری کوئی اور دبی باقی ہے

فیض ساقی بھی ہے گردش میں ہے پیمانہ بھی
پھر بھی اک کیفیت تشنہ لبی باقی ہے

آپ نے اشک محبت کو چھپایا تو بہت
پھر بھی رخسار پہ ہلکی سی نمی باقی ہے

ہم نے اک عمر ترے ساتھ گزاری ہے مگر
ہائے اب تک تری بیگانہ وشی باقی ہے

دوستو! شمعِ سحر گاہ جلاؤ کہ ابھی
دور تک سلسلۂ تیرہ شبی باقی ہے

صبح کو دور نہ کردے یہ خموشی کا طلسم
اور کچھ فکر کرو رات ابھی باقی ہے

یوں تو ہر چند سیے جیب و گریباں اے ذوق
پھر بھی دامن کی مگر بخیہ گری باقی ہے

اظہار قریشی

○

زلفِ پُر خم بھیگی رات
اف! دل کے باغی جذبات

شبنم روئی گلشن گلشن
ہائے رے پھولوں کی اموات

واعظِ ناداں تو کیا جانے
مے کی وسعت مے کی بات

طوفانوں کی گود میں طوفاں
جھلمل جھلمل شمعِ حیات

کس پر کس کا بل چلتا ہے
حاوی ہوتے ہیں حالات

کون کرے اظہار محبت
کون سنائے دل کی بات

اعجاز اختر

○

یہ حقیر سا تحفہ، کتنا بیش قیمت ہو جب وہ سب سے چھپ کر دے
اک اکیلے کمرے میں ننھی سیپ میں رکھ کر، پیار کا سمندر دے

ان اندھیری راتوں میں، جگنوؤں کی ننھی سی روشنی غنیمت ہے
اے خدا! رہائی کے بعد اپنی روحوں کو جگنوؤں کا پیکر دے

ٹوٹی چوڑیاں جیسے بے صدا خموشی میں، اک کہانی کہتی ہیں
صرف مدعا یہ ہے بنت سے لباسوں میں کوئی روشنی بھر دے

شعروں کے تصور میں کھوئے کھوئے ذہنوں کو، یہ خیال تو آیا!!
ان اندھیرے کمروں میں یادوں کے دیے رکھ کر کوئی چاندنی کر دے

چاند کی محبت تھی ہم کو سرد کرنوں کی آگ سے جلا ڈالا
اے خدا! ہمیں کوئی اتنی ہی محبت سے آگ کا سمندر دے

اعجاز اختر

○

اس میل کے پتھر سے کچھ صدیوں کا بندھن ہے
ان پیڑوں کے پتوں میں یادوں کا ہراپن ہے

اس لان میں پھیلی ہے خوشیوں کی ہری چادر
قدموں کے ترنم پہ گاتا ہوا آنگن ہے

جن کمروں میں نغمے تھے ان کمروں میں آنسو ہیں
جن کمروں میں آنسو تھے، ہنستا ہوا ساون ہے

اس شہر کی ساری ہی گلیوں سے کوئی رشتہ
ان گلیوں کے ہر گھر سے انجانا سا بندھن ہے

مٹی کے کھلونے ہیں، مٹی میں نہ کیوں کھیلیں
اک کچے سے آنگن میں روتا ہوا بچپن ہے